مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ | ذی الحج ۱۴۳۹ھ | ستمبر ۲۰۱۸ء | شمارہ ۹

سلوۃ الحزین
غمزدہ کی تسلی

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے
زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

سلوۃ الحزین
(غمزدہ کی تسلی)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ	۹
۲.....	اقسام احکام	۱۰
۳.....	صبر کی حقیقت وضرورت	۱۰
۴.....	دنیا وآخرت میں فرق	۱۱
۵.....	شبہ کا جواب	۱۲
۶.....	انسان کی ناشکری	۱۳
۷.....	آج کل کے واعظین	۱۴
۸.....	بی بی تمیزہ	۱۵
۹.....	آج کل کی بزرگی	۱۵
۱۰.....	بزرگوں کی سادگی	۱۶
۱۱.....	مریض کا حال	۱۷
۱۲.....	کمال بزرگی	۱۸
۱۳.....	عبادت اور طاعت میں فرق	۱۹
۱۴.....	بندگی کی حقیقت	۲۰
۱۵.....	اپنی جان کے حقوق	۲۱

۱۶.....	قربانی کی حقیقت	۲۲
۱۷.....	چلہ کشی کی حقیقت	۲۲
۱۸.....	کمال بزرگی	۲۴
۱۹.....	ہماری ذمہ داری	۲۵
۲۰.....	حق تعالیٰ کی قدردانی	۲۵
۲۱.....	لوگوں کی حالت زار	۲۶
۲۲.....	ناپسندیدہ لوگ	۲۷
۲۳.....	انتخاب آیت کی وجہ	۲۸
۲۴.....	حق تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کا ظہور	۲۸
۲۵.....	اپنے کو کمتر سمجھو	۳۰
۲۶.....	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب	۳۱
۲۷.....	توکل کی حقیقت	۳۳
۲۸.....	حضرت یوسف علیہ السلام کا توکل	۳۴
۲۹.....	اللہ تعالیٰ کا عجیب انداز حفاظت	۳۵
۳۰.....	والدہ موسیٰ علیہ السلام کا کمال توکل	۳۶
۳۱.....	ایاز کی فرمانبرداری	۳۷
۳۲.....	ایاز کا حضرت آدم کی سنت پر عمل	۳۸
۳۳.....	شیطان کا عذر لنگ	۳۹
۳۴.....	ایاز کا جواب لاجواب	۳۹
۳۵.....	عارفین کا مذاق	۴۰

۳۶.....	والدہ موسیٰ علیہ السلام کا کمال ضبط	۴۰
۳۷.....	اشکال کا جواب	۴۲
۳۸.....	موسیٰ علیہ السلام کے لیے حفاظتی تدابیر	۴۲
۳۹.....	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی گود میں واپسی	۴۴
۴۰.....	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عجیب واقعات	۴۵
۴۱.....	جنات کی قوت وشکل وصورت	۴۶
۴۲.....	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات وتدفین	۴۶
۴۳.....	صبر کی تلقین	۴۸
۴۴.....	تسلی کا خوبصورت انداز	۴۹
۴۵.....	بدوی کی ابن عباسؓ کو نصیحت	۵۰
۴۶.....	بدووں کے احوال	۵۰
۴۷.....	مومن ہمیشہ راحت میں ہے	۵۲
۴۸.....	شبہ کا ازالہ	۵۳
۴۹.....	مومن کے لیے دوزخ کی مثال	۵۴
۵۰.....	وجہ تسلی	۵۶
۵۱.....	مرحومین کی آپس میں ملاقات	۵۶
۵۲.....	عارفین کی شان	۵۷
۵۳.....	اللہ کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں	۵۸
۵۴.....	احکام دین کو ہلکا سمجھنے کی سزا	۵۸
۵۵.....	حمام اعظم	۵۹

۵۶.....	موت پر غم کرنے کی حقیقت اور حکمت	۵۹
۵۷.....	شبہ کا جواب	۶۱
۵۸.....	مقصود کائنات	۶۱
۵۹.....	حکمت غم	۶۲
۶۰.....	غم ممنوع	۶۲
۶۱.....	بوقت غم ذکر اللہ کرنے کا راز	۶۳
۶۲.....	مراقبہ دفع غم	۶۴
۶۳.....	محبت کا مقتضاء	۶۵

وعظ

سلوۃ الحزین

(غمزدہ کی تسلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم .اما بعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ ''سلوۃ الحزین'' ۲۱ شوال المکرّم ۱۳۳۵ھ کو جلال آباد ہندوستان میں ۳ گھنٹے ۲۳ منٹ تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا حضرت رحمۃ اللہ علیہ طالب علم عبدالرحیم کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے تھے وعظ میں صبر کے فضائل پر کلام فرمایا اس سے قبل کیرانہ میں تشریف لے گئے تھے جہاں موت ہونے کی وجہ سے صبر کی تلقین فرمائی تھی لیکن وہ مضامین ضبط نہ ہو سکے تھے اس لیے ان کا اعادہ بھی فرمایا اور جدید مضامین بھی ذکر فرمائے طلباء اور عوام کا مجمع تھا، غمزدہ افراد کی تسلی کے لیے بہترین مضامین مذکور ہیں جو مصیبت کے موقع پر صبر کا باعث ہیں۔ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ ضبط فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۱۲۵ تھی۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۵/۷/۲۰۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتو کل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَلَا تَخَافِیۡ وَلَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡكِ وَجَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴾(۱)

یہ ایک آیت ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جو ان کی والدہ ماجدہ کو خطاب ہوا تھا وہ اس آیت میں مذکور ہے ہر چند کہ اس مضمون کی خود فی نفسہ بھی ضرورت ہے کیونکہ مفید مضمون ہے لیکن اس وقت اس کے اختیار کرنے کی زیادہ وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون کیرانہ(۲) میں بیان کیا گیا تھا اور چونکہ وہ بیان عمدہ عمدہ مضامین اور تقاریر مناسبہ پر مشتمل تھا اور ضبط ہوا نہ تھا(۳) اس لئے اس کا اعادہ مناسب معلوم ہوا اور گو کیرانہ میں خاص موقع اور خاص ضرورت تھی مضمون خاص کی اس لئے بعض مضامین تو اُسی موقع کے لیے مخصوص تھے مگر اُن کے ضمن میں عام مضامین بھی اچھے بیان ہوگئے تھے جو عام ضرورت کے تھے اور اس وقت کوئی ضبط (۴) کرنے والا نہ تھا اس لئے اُن مضامین کے ضبط نہ ہونے کا افسوس رہا سو آج اس کا اعادہ کرتا ہوں کیونکہ ضبط کا سامان موجود ہے۔ اور نیز جن ایام اور تاریخوں اور

(۱) ''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا (جب تک انکا اخفاء ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈالدینا اور نہ تو (غرق کا) اندیشہ کرنا اور (مفارقت پر) غم کرنا ہم ضرور ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور ان کو پیغمبر بنادینگے'' سورۃ القصص: ۷ (۲) ہندوستان کا ایک قصبہ (۳) کسی نے محفوظ نہیں کیا تھا (۴) لکھنے والا۔

جس دن میں وہاں بیان ہوا تھا وہ زمانہ یہاں بیان کے لیے موعود تھا(۱) مگر اتفاق سے وہ زمانہ وہاں صرف ہوگیا سو اس وجہ سے بھی کہ وہ بیان اور تاریخ اور زمانہ یہاں موعود تھا اس کا یہاں بیان کردینا مناسب ہے۔ اعادہ مضمون کے لیے ایک نکتہ یہ بھی مرجح ہوگیا اور اصل وجہ تو یہ ہے کہ مضامین پسند آئے جی چاہا کہ ضبط ہوجائیں باقی یہ ضروری نہیں کہ اس کا بعینہ اور بالفاظ (۲) اعادہ کروں جو باتیں بیان کردہ یاد آجاویں گی ان کا اعادہ کردوں گا اور جو نئی باتیں اس وقت ذہن میں آجائیں گی ان کو بھی بیان کردوں گا کیونکہ یہ پہلے سے ذہن میں نہ تھا کہ اس مضمون کے اعادہ کی حاجت ہوگی۔ غرض خدا کے نام پر شروع کرتا ہوں جتنے یاد آگئے اُن کو بیان کردوں گا ورنہ اور جس قدر مضامین ہوں گے وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ہوں گے۔

اقسام احکام

وہاں پر اس مضمون کے بیان کی ایک وجہ تو خاص یہ تھی کہ وہاں پر اُس گھر میں موت کا واقعہ ہوگیا تھا اس ضرورت سے یہ مضمون اختیار کیا گیا تھا اور اسی وجہ سے بیان بھی کیا گیا تھا اور دوسری حقیقی وجہ اس کی عام ضرورت تھی اس لئے کہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے کوئی شخص ایسا نہیں جس کو اس کی ضرورت نہ ہو قرآن مجید میں دونوں قسم کے احکام مذکور ہیں، وہ بھی ہیں جن کا شان نزول واقعہ خاصہ ہے اور حکم بھی اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بھی ہیں جن کا شان نزول خاص ہے مگر حکم خاص نہیں بلکہ عام ہے اور زیادہ حصہ قرآن کا ایسا ہی ہے یعنی جس کا حکم شان نزول کے ساتھ خاص نہیں اور یہ بیان بھی ایسا ہی ہے لہٰذا اس معنی کر اسکا اعادہ یہاں پر بے ربط (۳) بھی نہ ہوگا۔

صبر کی حقیقت وضرورت

اب مضمون سنئے۔ اس آیت میں صبر کے متعلق مضمون ہے اور صبر کی سب ہی کو ضرورت ہے اس لئے ثابت ہوگیا کہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے وجہ یہ کہ دنیا میں واقعات دو قسم کے ہوتے ہیں ۔۱۔ ملائم اور ۲۔ مخالف (۴)۔ یعنی بعضے واقعات وہ پیش

(۱) ان دنوں میں یہاں بیان کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا (۲) ضروری نہیں کہ وہی مضمون انہی الفاظ میں بیان ہو (۳) بے جوڑ (۴) طبیعت کے مطابق اور مخالف۔

آتے ہیں جو طبیعت کے مناسب اور موافق ہوتے ہیں اور بعضے واقعات طبیعت کے موافق اور مناسب نہیں ہوتے۔ غرض ہر شخص کو دونوں قسم کے حالات پیش آتے ہیں جب مناسب طبیعت کے واقعات پیش آویں اس وقت شریعت کی تعلیم شکر ہے اور جب ناملائم اور مخالف طبیعت کے واقعات پیش آویں اس وقت شریعت مقدسہ نے ضبط کی تعلیم فرمائی ہے اور اسی کا نام صبر ہے اور چونکہ عام طور پر بہ نسبت ملائم (۱) واقعات کے ناملائم (۲) اور غیر مناسب طبیعت کے واقعات کا ظہور بکثرت ہوتا ہے یعنی ہر شخص کو مخالف طبع واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس لئے مضمون صبر کی ضرورت عامہ اور زیادہ ہوئی پس مناسب ہوا کہ یہ مضمون ضرور بیان کیا جائے اور انسان کی ہر خواہش کا پورا نہ ہونا جس کا ابھی ذکر ہوا مشاہد بھی ہے اور منصوص (۳) بھی۔

دنیا و آخرت میں فرق

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی﴾ (۴) کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے (سو ایسا نہیں ہے) کیونکہ ہر تمنا خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت کی بھی اور دنیا کی بھی ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ (۵) جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال دیدیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ آیت میں دو قیدیں ذکر فرمائی ہیں ایک یہ کہ جتنا چاہیں یعنی ہر شخص کو اُس کی مقدار طلب پر نہ دیں گے اور دوسرے یہ کہ جس کے واسطے چاہیں گے اس کو دیں گے ہر شخص کو نہ دیں گے دنیا کے طالب کے ساتھ تو حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہے اور آخرت کے طالب کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے آگے اسی آیت کے متصل فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ یعنی اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لیے جیسے سعی کرنا چاہئے ویسی ہی سعی بھی کریگا بشرطیکہ وہ شخص مؤمن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاویگی

(۱) موافق طبیعت (۲) طبیعت کے خلاف (۳) مشاہدہ بھی ہے اور قرآن میں اس کا ذکر بھی ہے
(۴) النجم: ۵۳/۲۴۔۲۵ (۵) الاسراء: ۱۷/۱۸۔

حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی سعی کے مطابق ثمرہ ملے گا بلکہ سعی سے زیادہ ملے گا جس کو دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے (اس میں زیادہ دینے کی تصریح ہے) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا دیں گے اور آخرت میں اُس کا کچھ حصہ نہیں۔ غرض دنیا ہماری خواہش پر اور جتنی ہم چاہیں نہیں مل سکتی بلکہ حق سبحانہ کی مشیت کے مطابق اور جس قدر وہ چاہیں ملتی ہے اور آخرت جس قدر ہم چاہیں اسی قدر ملتی ہے بلکہ اور زیادتی اور ترقی کے ساتھ ملتی ہے۔ دنیا کی عجب خاصیت ہے۔ بہرحال ان نصوص سے معلوم ہوا کہ دنیا کے مقاصد بہت کم پورے ہوتے ہیں اس لیے یہ کہنا صحیح ہوا کہ امور ملائمہ (۱) کم پیش آتے ہیں اور امور ناملائمہ زیادہ (۲)۔

شبہ کا جواب

اس پر ظاہر میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ایک آیت سے تو نعم غالب معلوم ہوتی ہیں اور مصائب مغلوب چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۳) اور اللہ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نعم بے شمار ہیں نعم کی بابت تو یہ ارشاد ہے اور دوسری جگہ مصائب کی نسبت فرماتے ہیں: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (۴) اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے آتی ہے اور بہت سے تو اللہ تعالیٰ درگزر کر ہی دیتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصائب قلیل ہیں اور امور ناملائم کا بکثرت پیش آنا کیسے صحیح ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ نعم بکثرت ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی نعمتوں کو بھی پسند نہیں کرتے یعنی حق تعالیٰ کی نعمتیں بھی ہماری ملائم طبع نہیں گو واقع میں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں بے شمار ہیں مثلاً بیماری میں ہمارے لیے دوائیں اور مکانات کا مہیا کرنا اور ہر

(۱) طبیعت کے موافق باتیں (۲) خلاف طبیعت (۳) النحل: ۱۶/۱۸ (۴) الشوریٰ: ۴۲/۳۰۔

وقت ہر طریقہ سے ہماری مداراۃ(۱) ہونا حتی کہ غیر مہربان دشمن کا مہربان ہوجانا یہ کیا تھوڑی نعمت ہے۔

بلابودے اگر این ہم نبودے(۲)

چنانچہ جنگ میں بکثرت آدمی زخمی ہوتے ہیں اپنے آدمی تو اُٹھا کر اُن کو آرام دیتے ہی ہیں لیکن اگر اپنے آدمی شکست کھا کر فرار ہوجاتے ہیں اور میدان میں زخمی رہ جاتے ہیں تو غنیم بھی(۳) اُن کے ساتھ بدمعاملگی سے پیش نہیں آتے بلکہ ان کی مرہم پٹی کرتے ہیں اور راحت پہنچاتے ہیں یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اسی طرح غور کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصیبت میں بھی حق تعالیٰ کی طرف سے متعدد نعمتیں ہمارے اوپر ہوتی ہیں بیماری ہونا ظاہر میں مصیبت ہے لیکن طبیعت اور دوا اور تیمارداروں کا ہونا کتنی عظیم نعمت ہے۔ ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقع میں تو مصائب بہت کم پیش آتے ہیں اور نعم بکثرت ہیں مصیبت زیادہ نہیں ہے مگر اس کے ساتھ وہ مقدمہ بھی صحیح ہے کہ امور ناملائم اور مخالف طبع بکثرت پیش آتے ہیں جیسا ابھی مذکور ہوا کہ ہمارے ضعف وجہل سے وہ نعم بھی ناملائم طبع ہوتے ہیں یہ عجیب جمع بین المتنافیین ہے(۴) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کو اپنے موافق مزاج نہیں سمجھتا بلکہ بہت سی نعمتوں کو خلاف طبع اور ناگوار سمجھتا ہے۔

انسان کی ناشکری

اور انسان تو ایسا ناشکرا ہے کہ جو مزاج کے موافق نعمتیں ہیں بسا اوقات اُن کو بھی پسند نہیں کرتا عجیب نخرہ باز ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ تو نعمتیں دیتے ہیں اور انسان ناک منہ چڑھاتا ہے مثلاً اللہ میاں کھانا دیتے ہیں تو کھانا اس کے موافق مزاج نہیں ہوتا کہ یہ تو اچھی طرح بھنا نہیں، اس میں تو ہلدی زیادہ ہے، ہلدی کی بو ہے، بالکل ہی خشک ہے گھی نہیں ہے حالانکہ اصل یہ ہے کہ ہم تو اس کے بھی مستحق نہیں ہیں مگر انسان کو پھر بھی اسقدر نخرہ ہے جس کی حد نہیں یہ ہر نعمت کی ناشکری اور ناقدری کرتا ہے ہر وقت ناک منہ

(۱) ہماری دیکھ بھال کرنا (۲) اگر یہ بات بھی نہ ہوگی تو یہ ایک اور مصیبت تھی۔ (۳) دشمن (۴) ایک دوسرے کی منافی باتوں کا جمع ہونا ہے۔

چڑھاتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ نعمت بھی ملے تو اس طرح ملے جس طرح میں چاہتا ہوں چنانچہ اگر کبھی اس کو روپیہ کی ضرورت ہو تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ قرض نہ لیں کوئی ہدیۂ دیدے مثلاً میرے پاس اسی واسطے کہ میں کسی کا قرض کرنا نہیں چاہتا حق تعالیٰ کتنے ہدایا بھجواتے ہیں لیکن اگر کبھی شاذ و نادر قلیل مقدار بھی قرض کرنا پڑے تو گراں ہوتا ہے۔ بتلایئے اس میں ہمارا کونسا استحقاق تھا پھر جب ہمارا کوئی استحقاق نہیں اور حق تعالیٰ بدون استحقاق کے نعمتیں دیتے ہیں تو کیا پھر بھی ہم کو ذرا سی خلاف تجویز بات پر ناک منہ چڑھانا چاہئے ہرگز نہیں حضور کی عادت شریف تھی کان لا یعیب شیئا کہ حضور کسی چیز میں عیب نہیں نکالا کرتے تھے۔

آج کل کے واعظین

دین یہ ہے، دین محض نوافل اور تسبیح کا نام نہیں۔ ایک مقام میں ایک واعظ تھے اُن کی عادت یہ تھی کہ اگر کوئی دعوت کرتا اور گھی کم ڈالتا تو کھانا نہ کھاتے کہ اس میں تو گھی کم ہے یا متعدد کھانے نہیں ہیں افسوس مصلحین دین کی یہ حالت۔ تعجب ہے، مگر یہ حالت دوسروں ہی کے گھر پر ہے اپنے گھر شاید ایسا نخرہ نہ کرتے ہوں کیونکہ گھر کا خرچ ہوگا۔ بعض احباب نے دہلی میں ایک جلسہ میں مجھ کو مدعو کیا اور چلتے وقت پچیس روپیہ تھانہ بھون کی زادراہ(۱) کے لیے دینے لگے میں نے کہا کہ تھانہ بھون دور نہیں صرف چار روپیہ کا تقریباً صرف ہوگا وہ کہنے لگے کہ کل پرسوں ایک مولوی صاحب تشریف لائے تھے وہ ایک دن میں گیارہ روپیہ کے پان کھا گئے۔ بکری کو بھی مات کر دیا مگر آبرو کی بکری(۲) ہوگئی اور خود تو کیا کھاتے بس جو آیا تواضع پر تواضع کی کہ آپ بھی کھایئے اور آپ بھی کھایئے کیونکہ مفت کا مال تھا۔ مال مفت دلِ بے رحم۔ ایک واعظ صاحب کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ رخصت کے وقت ساٹھ روپیئے کرایہ کے لیے تھے کیونکہ فسٹ کلاس کا ٹکٹ اسی کے قریب ہوگا گو سفر کیا ہو تھرڈ ہی میں آجکل یہ امور بھی بزرگی کے خلاف نہیں۔

(۱) سفر خرچ (۲) عزت تو بکی۔

بی بی تمیزہ

آجکل کی بزرگی بھی بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا بی بی تمیزہ کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک فاحشہ عورت تھی اس کو ایک مولوی صاحب نے نماز کی نصیحت کی اور وضو کرا کے نماز پڑھوائی لباس وغیرہ بدلوایا۔ سال دو سال کے بعد پھر مولوی صاحب کا آنا ہوا تو مولوی صاحب نے بی بی تمیزہ سے دریافت کیا کہ بی نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا حضرت پانچوں وقت، پوچھا کہ وضو بھی کر لیتی ہو کہا جب آپ نے نماز پڑھوائی تھی اس وقت تو آپ نے وضو کرادیا تھا اُسی سے پڑھ لیتی ہوں۔ بندئ خدا کا وضو جنابت (۱) اور سونے سے بھی نہ گیا اور حیض ونفاس سے بھی نہ ٹوٹا بدکاری سے بھی باطل نہیں ہوا عجیب وضو تھا۔

آج کل کی بزرگی

ایسی ہی آجکل کی بزرگی ہے کچھ ہی کرلو مگر بزرگ کے بزرگ اور ارزاں اتنی کہ علم تک کی ضرورت نہیں پس مثنوی کے کچھ اشعار یاد کرلئے مجلس کے گرم کرنے کو ذرا خوش آوازی سے اشعار موقع بموقع پڑھ دیئے جیسے تھیٹر (۲) کی مجلس ہوتی ہے بس سامعین کی طبیعت خوش ہوگئی یہ حقیقت ہے آجکل کے واعظین کے وعظ کی مجھے ایک مرتبہ الٰہ آباد میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا اول تو میری آواز کچھ زیادہ اچھی نہیں مزید براں زکام کی بھی شکایت تھی تو ایک صاحب نے فرمایا کہ وعظ تو اچھا ہے مگر آواز اچھی نہیں مجھے معلوم ہوا میں نے کہا کہ میرا باپ ڈوم (۳) نہ تھا، نہ میں نے آواز صاف کرنے کی کوئی تدبیر کی۔ نہ خارجی تدبیر کہ حلو وغیرہ باندھتا نہ داخلی تدبیر کی کہ کوئی ایسی چیز کھاتا۔ اور نہ اسکی کوئی حاجت تھی کیونکہ مقصود تو کام چلانا ہے چلالیا۔ افسوس ہے کہ آجکل خوش آوازی کی بناء پر میراثی بھی واعظ ہوگئے۔ یہ مطلب نہیں کہ کم ذات ہونے کی وجہ سے وعظ نہ کہنا چاہئے تھا کیونکہ اگر کوئی میراثی عالم محقق بن جائے تو اس کو وعظ کہنا بجا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ آجکل میراثیوں نے بھی دو چار اردو کی کتابیں یاد کرکے وعظ گوئی شروع کردی مضمون تو خاک نہیں ہوتا بس اشعار کو گا کر اچھی آواز بنا کر پڑھ دیتے ہیں، لیجئے بس واعظ ہوگئے۔ اور

(۱) غسل واجب ہونے کی حالت سے بھی نہ ٹوٹا (۲) تماشا گاہ کی مجلس ہوتی ہے (۳) مراثی اور قوال۔

زیادہ افسوس یہ ہے کہ ایسے جہلاء آجکل مقتدائے دین شمار کئے جاتے ہیں لوگوں میں قابل وناقابل کا بالکل امتیاز ہی نہیں رہا۔ یہ تو جاہلوں کی حالت ہے کہ وہ اشعار پڑھ کر واعظ بن جاتے ہیں اور جو واقعی پڑھے لکھے مولوی ہیں ان میں یہ کسر ہے کہ اُن میں بجائے شان علم کے ریاست اور نوابی کی شان آ گئی کہ وہ جہاں جاتے ہیں ساتھ میں دو چار خادم ہوتے ہیں اور جبّہ عمامہ اور قیمتی کپڑے پہنتے ہیں حالانکہ یہ بھی نقص کی دلیل ہے۔

بزرگوں کی سادگی

ہم نے اپنے بزرگوں کی سادگی دیکھی ہے اور یہ بزرگ ایسے تھے کہ اگر کوئی اُن کے علم وفضل کا حال سنے اور انکا نام نہ لیا جاوے تو ضرور یہ کہیگا کہ یہ لوگ متقدمین علماء کی جماعت سے ہیں مگر سادگی ایسی کہ جناب مولانا فتح محمد صاحبؒ کے مکان پر ایک بار ایک نائب تحصیلدار ملنے کی غرض سے آئے اس وقت مولانا تشریف فرما نہ تھے گنگوہ تشریف لے گئے تھے یہ معلوم کرنے کے بعد انہوں نے چلتے ہوئے ایک طالب علم کو ایک شعر پرچہ میں لکھ کر دیدیا کہ جب مولانا تشریف لاویں تو یہ شعر دکھادیں اور آپ جلال آباد چلے گئے شعر یہ تھا ؎

چو غریب مستمندی بدرت رسیدہ باشد چہ قدر تپیدہ باشد چو تر اندیدہ باشد(۱)

اتفاق سے مولانا اُسی دن مغرب کے وقت تشریف لے آئے اس طالب علم نے وہ پرچہ پیش کر دیا مولانا دیکھ کر بے چین ہوگئے کہ اُن صاحب کو میرے نہ ملنے سے بہت قلق ہوا ہوگا۔ اپنے اوپر قیاس فرمایا چنانچہ فوراً اسی وقت جلال آباد تشریف لائے جو تھانہ بھون سے دو میل ہے اور اُن صاحب سے مل کر فوراً واپس ہوئے یہ ہے بزرگی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ بزرگ جن کی یہ حکایت ہے اپنے عہد میں مشہور بزرگوں کے کسی درجہ میں شمار نہیں کئے جاتے تھے چاہے وہ عنداللہ سب سے افضل اور مقدم ہوں مجھے تو ان حضرات کے حالات پیش نظر کر کے یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

یہ ہیں بزرگ جن پر تمام دنیا کو فخر ہے محض نام کے درویش نہیں کہ موٹے

اولئك اٰبائی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

(۱) ''ایک غریب حاجتمند تمہارے دروازے پر آیا تمہیں گھر پر نہ پاکے اس کو بہت صدمہ ہوا''

موٹے دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لٹکالی ہو۔ تسبیح کی تسبیح اور ہتھیار کا ہتھیار یہ لوگ ایسے درویش نہیں تھے یاد رکھو بزرگی تسبیح سے نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بزرگوں کے سے اخلاق ہونے چاہئیں۔ صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کسی کھانے میں عیب نہ نکالیں اور وہ محض اس غرض سے کہ لوگ کہیں کہ کیسے بے نفس ہیں کہ کسی بات پر کچھ نہیں فرماتے سو یہ تو کچھ بھی بزرگی نہیں بلکہ تکبر اور جاہ طلبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ نہ افراط مناسب ہے اور نہ تفریط شایاں ہے اعتدال کی ضرورت ہے اور یہی بزرگی ہے اور یہی اعتدال (۱) مشکل ہے کیونکہ اعتدال میں کمال مخفی ہوجاتا ہے ایسے شخص کو لوگوں کی نظروں میں امتیاز حاصل نہیں ہوتا اس لئے تعریف نہیں ہوتی اور بدون امتیاز وتعریف کے شہرت دشوار ہوتی ہے اس لئے آجکل اعتدال سے گذر کردہ امور اختیار کرتے ہیں جن سے شہرت ہو مثلاً کھانا کھانا چھوڑ دیں گے غلہ اور اناج ترک کردیں گے مگر غذا میں آدھ پاؤ بالائی، چھٹا نک بھر مغز بادام اور دوسرے میوہ جات وغیرہ وغیرہ غرض تین پاؤ وزن کا سامان کھالیں گے اور کہنے کو یہی رہے گا کہ حضرت کھانا نہیں کھاتے میں کہتا ہوں کہ اور کیا کھاویں گے بس اب تو یہ کسر باقی رہ گئی کہ مجھے اور تمہیں کھالیں۔ صاحبو! جو لوگ کھانا کھانے والے سمجھے جاتے ہیں یہ غذا تو اُن کو بھی نہیں ملتی۔

مریض کا حال

یہ نہ کھانا تو ایسا ہوگیا جیسے ایک طبیب کے پاس ایک مریض امیر آیا اور ضعف معدہ کی شکایت کی حکیم صاحب نے کہا کہ ایک دن میرے سامنے کھاؤ۔ چنانچہ مریض ایک دن طبیب کے سامنے کھانے بیٹھا طبیب نے ایک خالی برتن پاس رکھدیا کہ جس قدر کھاتے جاؤ اُسی قدر اس میں جمع کرتے جاؤ چنانچہ جتنا اُس نے کھایا اتنا ہی اُس برتن میں جمع کردیا جو بعد میں تولا گیا تو سیر بھر تھا طبیب نے کہا کہ میاں اگر اس پر بھی ضعف معدہ ہے تو کیا دسترخوان اور برتن کھاؤ گے۔ پیٹ کیا ہوا داستان امیر حمزہ کی زنبیل (۲) ہوگئی۔

(۱) میانہ روی (۲) ایک روایتی تھیلی جو داستان امیر حمزہ کے کردار عمرو عیار کے پاس تھی وہ جو چاہتا اس میں رکھ لیتا۔ اور محاورۃ ایسی تھیلی کو کہتے ہیں جس میں بہت سی چیزیں سما جائیں۔

اسی طرح آج کل بزرگی کیا ہوئی نوابی ہوگئی۔

کمال بزرگی

صاحبو! بزرگی کا کمال یہ ہے کہ حضور کے قدم بقدم ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے ایسے امتیازات کبھی اختیار نہیں فرمائے حضور نے کمبل بھی زیب تن (۱) فرمایا ہے اور سنہری گھنڈیاں بھی لگانا ثابت ہیں جیسے کمبل حضور کو محبوب تھا سنہری گھنڈی بھی عزیز و مرغوب تھی۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ میرے ایک ماموں صاحب ایک برات میں کمبل اوڑھ کر گئے اور میرے والد صاحب دوشالہ اوڑھے ہوئے تھے تو والد صاحب نے اُن سے کہا کہ میاں شادی میں تو کمبل اُتار دیا ہوتا وہ کہنے لگے کہ آپ نے دوشالہ اُتار دیا ہوتا آپ کو دوشالہ جیسا مرغوب اور پسند ہے مجھے کمبل اُس سے کم مرغوب نہیں خیر یہ ان کا حال تھا ورنہ ایسی پابندی کرنا اس میں بھی ایک شان امتیاز پیدا ہوتی ہے تو یہ کمال نہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ نہ کمبل کا پابند ہو نہ دوشالہ کا کیونکہ بندہ تو سرکاری ملازم اور غلام ہے جو پہنایا پہن لیا اور جو اوڑھایا اوڑھ لیا ملازم کا تو یہ کام ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ورکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو (۲)

ایک بزرگ تھے کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے کہ اچانک کمبل اتار کر پھینک دیا تھوڑی دیر میں ایک شخص دوشالہ لیکر حاضر ہوا جس کے پلّوں پر زری کا کام چار انگشت بقدر جواز لگا ہوا تھا آپ نے قبول فرما کر اُسے زیب تن کیا اور ہنسے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی فرمایا کہ میں کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا حکم ہوا کہ اس میں اچھے نہیں لگے اس کو پھینکدو ہم دوشالہ پہنا کر دیکھیں گے میں نے کمبل اُتار کر پھینکدیا اور دوشالہ پہن لیا۔ غرض غلام کی یہی شان ہونا چاہیئے کہ آقا جس حال میں رکھے اُسی میں خوش رہے جیسے ایک شخص نے ایک غلام خریدا تھا خریدنے کے بعد دریافت کیا کہ میاں تمہارا کیا نام ہے اُس نے جواب دیا کہ حضور آج سے تو وہی نام ہے جس نام سے آپ پکاریں دریافت کیا کہ کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا کہ حضور آج سے خوراک بھی وہی ہے جو آپ کھلادیں دریافت کیا کہ پہنا کیا کرتے ہو کہنے لگا کہ آج سے پوشاک بھی وہی ہے

(۱) کمبل اوڑھنا بھی ثابت ہے (۲) ''زندہ رکھیں آپ کی مہربانی موت دیں تو جان آپ پر فدا''۔

جو حضور پہنا دیں تو حقیقی آقا کے سامنے بندہ کی یہ شان ہونا چاہئے۔

عبادت اور طاعت میں فرق

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آیت: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (۱) پر اشکال کیا گیا کہ اسمیں جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری ہی مخلوق کرتی ہے کچھ جن وانس کی تخصیص نہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت ہے اول ایک مثال سے ان دونوں مفہوموں میں فرق سمجھ لو وہ یہ کہ ایک تو نوکر ہے اور ایک غلام ہے۔ نوکر کا کام تو معین ہوتا ہے خواہ ایک یا متعدد مثلاً باورچی ہے کہ اس کے لیے کھانا پکانے کی خدمت معین ہے یا سپاہی ہے یا مکان پر بازار اور گھر کام کرنے کے واسطے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ لوگ نوکر ہیں اُن سے وہی خدمت لی جاسکتی ہے۔ خود آقا بھی اسکا لحاظ رکھتے ہیں۔ حتی کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط لیکر گنگوہ چلے جاؤ تو نوکر ضابطہ میں انکار کرسکتا ہے۔ اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں ہوتی بلکہ تمام خدمات اُس کے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہوجاوے چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام اور نائب بنکر جلسہ میں یا دربار میں جانا پڑتا ہے غرضکہ غلام کو کسی وقت بھی کسی خدمت سے انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح جن وانس کے سوا تمام مخلوق کی طاعت معین ہے ہر شئی مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا دوسرا کام اُس سے نہیں لیا جاتا مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے ایک وقت میں پاخانہ بھرنا بھی عبادت ہے مثلاً جماعت تیار ہو اور پیشاب پاخانہ کا زور ہو تو اس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا اس وقت حرام ہے اگر پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل نہ کی تو حرام فعل کا مرتکب ہوا اس وقت اس کا بیت الخلاء میں جانا عبادت ہے ایک وقت تو انسان کی یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔ غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی شان

(۱) اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں الذاریات: ۵۱/۵۶۔

انسان کی ہے۔ عبد شدن (۱) کے لیے انسان ہی ہے باقی تمام مخلوق ذاکر شاغل ہے مگر عابد صرف انسان ہی ہے یہ کسی خاص حالت اور اور خاص کام کو اپنے لیے تجویز نہیں کرسکتا۔

بندگی کی حقیقت

بلکہ حضرت حق جس حالت میں رکھیں اُسی میں اس کو رہنا چاہئے کمبل اوڑھائیں تو کمبل اوڑھے دوشالہ اُڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے یہی شان تھی حضور کی مگر آجکل اس کے خلاف لوگوں نے تجویز اور امتیاز کا نام بزرگی رکھ لیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں گھی نہیں کھاتے پس یہ معیار رہ گیا ہے بزرگی کا کوئی کہتا ہے کہ فلاں بزرگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے بڑے رحم دل ہیں کہ قربانی نہیں کرتے جانور کے گلے پر چھری رکھنے کو اچھا نہیں سمجھتے حالانکہ قربانی میں تو جانور کو خدا کے نام پر فدا کرتا ہے اور اس وقت وہ جانور ہماری جانوں کے قائم مقام ہوتا ہے اگر حق تعالیٰ ہماری جان طلب فرماتے تو ہمیں تو اس میں بھی دریغ نہ ہونا چاہئے تھا چہ جائیکہ وہ ہمارے بجائے جانوروں کی جانیں طلب کرتے ہیں اور حکم فرماتے ہیں کہ ہمارے نام پر قربانی کرو جس سے اس شعر کا مصداق واقع ہوجائے ؎

آنکہ جان بخشد اگر بکشد رواست نائب است ودست او دست خداست (۲)

ایک ہندی مثل ہے گھی کہاں گیا کھچڑی میں اور کھچڑی کہاں گئی پیٹ میں تو گھی بھی پیٹ میں گیا اصل یہ ہے کہ جانور تمہارے لیے ہیں اور تم خدا کے لیے ہو کہ خدا کی عبات کرو اور اپنی چیزوں کو خدا کے نام پر قربان کرو تو وہ جانور بھی خدا کے لیے ہوا سو اس صورت میں قربانی کا جانور تمہارے لیے فدا نہیں ہوا بلکہ خدا کے لیے فدا ہوا پھر اس سے احتراز کرنا سخت حماقت ہے غرض تفویض کلی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل خلاف ہے مثلاً جب حق تعالیٰ کھانے پہننے کو اچھا دیں تو اس وقت خستہ حالت میں رہنا ناشکری اور نعمت کی ناقدری خلاف اطاعت ہے کیونکہ جیسے

(۱) بندگی کی شان انسان ہی میں ہے (۲) ''جس نے جان بخشی ہے اگر وہ جان لے لے تو درست ہے ذبح کرنے والا اللہ کا نائب ہے اور اس کا ہاتھ اصل میں اللہ کا ہاتھ ہے''۔

شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دو اور کھانا کپڑا دو۔

اپنی جان کے حقوق

ایسے ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو بھی راحت دو پس جیسے نوکر خدا کی مخلوق ومملوک ہے تمہاری جان بھی خدا کی مخلوق ومملوک ہے اس لئے تم کو اپنے اندر بھی بدون(۱) اجازت حق تعالیٰ کے کسی تصرف کا حق نہیں اگر نوکر کو حکم الٰہی سے کھانا کپڑا دیتے ہو تو اُسی آقا کے حکم سے تم اپنی بھی خدمت کرو کیونکہ تمہاری جان بھی خدا ہی کی ہے تمہاری ہرگز نہیں اسی حقیقت پر نظر کر کے ایک عارف فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم باپے خود کہ بکویت رسیدہ است (۲)

کہ مجھ کو اپنے اعضاء پر اس وجہ سے ناز ہے اور ان کی قدر ہے کہ آپ سے اُن کا تعلق ہے۔ صاحبو! ہمیں اپنی آنکھ سے اس وجہ سے تعلق نہ ہونا چاہئے کہ وہ ہماری آنکھ ہے بلکہ اس وجہ سے تعلق ہونا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی چیز ہے اور ان کی خدمت کرتی ہے اُس نے انکا جمال دیکھا ہے گو بواسطہ مظاہر ہی سہی آگے فرماتے ہیں ؎

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است (۳)

اس اعتبار سے عارف کو اپنے نفس سے بھی محبت ہوتی ہے اور اسی لیے حدیث میں ہے۔ ان لنفسك عليك حقا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے تو عارف کو اپنے نفس سے اس لئے محبت ہوتی ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے۔ دیکھو اگر کوئی مشین سرکاری کسی کے سپرد ہو تو اُس شخص کو اُس کے آلات کا صاف کرنا اور تیل دینا ضروری ہوگا البتہ اگر اپنی ملک ہو اس وقت اختیار ہے کہ چاہے صاف کر کے تیل دے چاہے نہ دے مگر جب ملک سرکاری ہے تو اس کو صاف کرنا تیل دینا ضروری ہے ورنہ باز پرس ہوگی اب یہاں پر لوگوں سے ایک غلطی تو یہ ہوا کرتی ہے کہ تیل نہیں دیتے اور اپنی جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اور ایک غلطی بعض سے یہ ہوتی ہے کہ تیل بہت دینے لگتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ

(۱) بغیر اجازت۔ (۲) ''اپنی آنکھوں پر اس لیے ناز ہے کہ وہ تیرے جمال کا دیدار کرتی ہیں اپنے پیروں پر اس لیے قربان ہوں کہ تیرے کوچے کی طرف چل کر جاتے ہیں'' (۳) ''اپنے ہاتھوں کو ہر وقت اس لیے چومتا ہوں کہ وہ تیرا دامن تھام لیتے ہیں۔

بعضے دنیادار فقیر یا تو اسباب حفاظت نفس کو اختیار نہیں کرتے اور اس کو نفس کشی (۱) سمجھتے ہیں یا اختیار کرتے ہیں تو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور نوابی رنگ کو شان محبوبیت سمجھتے ہیں۔ صاحبو! سر میں تیل لگانا بھی اس اعتبار سے محمود ہے کہ یہ سرکاری چیز ہے میرا سر نہیں۔ میں مالک نہیں یہ مضمون شاعرانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے مگر اس حقیقت تک رسائی تدریجاً (۲) ہوتی ہے ایک دن میں نہیں ہوتی اور ابتداء میں کسی قدر تکلف بھی کرنا پڑتا ہے مگر اخیر میں ملکہ ہو جاتا ہے (۳)۔ غرض عارف اس اعتبار سے حقوق النفس ادا کرتا ہے تاکہ خدا کا کام کرے۔

قربانی کی حقیقت

اسی طرح عارفین قربانی کے جانور کو خدا کے نام پر فدا کرتے ہیں اپنے اوپر فدا نہیں کرتے خواہ اپنے ہی کھانے کے لیے ذبح کریں۔ یہ ہے حقیقت قربانی کی، بعضے بزرگ ترحم کے غلبہ سے قربانی نہیں کرتے تھے بلکہ بجائے قربانی کے دام (۴) ادا کر دیتے تھے اور یہ ان کی غلطی تھی انہوں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ سواریوں پر بیٹھ کر پُلِ صراط کو قطع کر رہے ہیں (۵) انہوں نے سواری کی درخواست کی مگر یہ جواب ملا کہ یہاں پر تمہارے لیے کوئی سواری نہیں ہے اس نے سوال کیا کہ یہ کون لوگ ہیں جو سواریوں پر گذر رہے ہیں جواب ملا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قربانی کرتے تھے تم قربانی کرتے نہیں اس لئے تمہاری کوئی سواری نہیں پیادہ (۶) جاسکو تو چلے جاؤ جب بیدار ہوئے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا (۷) توبہ کی اور قربانی شروع کر دی۔

چلہ کشی کی حقیقت

مگر آجکل جہلاء اس قسم کی درویشی کی دلیل ترحم اور بزرگی خیال کرتے ہیں جس کی خدا کے یہاں کچھ بھی قدر نہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص چلہ (۸) کھینچ رہا ہے

(۱) نفس کو مار کر اس کی اصلاح کرنا (۲) آہستہ آہستہ (۳) اس پر قدرت ہو جاتی ہے (۴) پیسے (۵) پل صراط سے گذر رہے تھے (۶) پیدل (۷) اپنی غلطی کا احساس ہوا (۸) چالیس دن عبادت میں مشغول ہے

اور چلہ میں گوشت سے پرہیز ہے سبحان اللہ بس وہ عورتوں کا چلہ(۱) ہوگا جس کو زچگی کہتے ہیں شرعی چلّہ ہرگز نہیں کیونکہ شرعی چلّہ میں گناہوں کے سوا کسی چیز کا پرہیز نہیں ہوا کرتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل نبوت کچھ ایام کے لیے غار حرا میں بغرض خلوت تشریف لے جانا ثابت ہے اور بعد نبوت کے اعتکاف ثابت ہے مگر آپ نے کبھی گوشت سے پرہیز نہیں کیا پھر یہ کیسی بزرگی ہے کہ چلّہ کی وجہ سے لوگ ایک ایک مہینہ تک گوشت چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ حدیث میں ہے سیدالطعام اللحم(۲) دست کا گوشت کھانا حضور سے ثابت ہے بلکہ آپ کو بہت مرغوب تھا یہ گوشت کا پرہیز حضور سے ثابت نہیں اس لئے اتباع سنت نہیں۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک بڑے متبحر عالم نے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ چلّہ کھینچوں حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مولانا توبہ کیجئے بدعت ہے حالانکہ یہ سائل بہت بڑے عالم اور محدث تھے مگر ان کی نظر اس پر نہ پہنچی مگر حاجی صاحب نے فوراً فرمایا کہ یہ بدعت ہے حالانکہ حاجی صاحب اصطلاحی عالم(۳) نہ تھے مگر عالم گر تھے(۴) اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ لوگ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف کمالات سے معتقد ہیں مگر میں علم کی وجہ سے معتقد ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جب قوت حاسہ درست اور صحیح ہو تو کھانے میں کتنا ہی باریک بال کیوں نہ ہو محسوس ہو جاتا ہے اسی طریق سے جب فہم درست ہو تو حق و باطل میں فوراً امتیاز ہو جاتا ہے حضرت اپنے زمانہ میں صدیق اعظم تھے (جو بہت بڑا مرتبہ ہے مراتب ولایت میں سے) ہم لوگ اگر ترک حیوانات کو بدعت کہتے تو کچھ تعجب نہ تھا کیونکہ رات دن درس و تدریس و افتاء کا شغل رہتا ہے کتابیں دیکھ کر بدعت و سنت کا علم ہر ایک کو ہو سکتا ہے مگر حضرت تو درسی عالم بھی نہ تھے۔ حضرت نے محض نور قلب اور ذکاوت فہم سے فوراً اس کو بدعت فرمایا پس قربانی سے احتراز اور گوشت وغیرہ سے پرہیز یہ کید ہے کیّا دکا(۵) اور مکر ہے شیطان کا کہ عبادت کے رنگ میں دھوکہ دیتا ہے

(۱) عورت کو پیدائش بچہ کے بعد چالیس دن نفاس کا خون آتا ہے اس لیے اس کو چلہ کہتے ہیں اس زمانے میں عورت کو گوشت کھانا نقصان دیتا ہے اس لیے گوشت کھانے کو منع کرتے ہیں (۲) کھانوں میں بہترین کھانا گوشت ہے (۳) باقاعدہ درس نظامی نہیں پڑھا تھا (۴) عالم بنانے والے (۵) دھوکہ بازوں کا دھوکہ ہے۔

درحقیقت اس شخص کا مقصود اصلی شہرت ہے کہ کوئی جدید کام کیا جاوے تا کہ شہرت ہو اسی واسطے ایسے لوگ گوشت نہیں کھاتے کہ مشہور ہو جاویں باقی کاملین تو شہرت سے بھاگتے ہیں ان کی نظر ہر وقت عبدیت پر ہے اس لئے وہ پلاؤ اور قلیہ (۱) اور چٹنی ایک ہی رغبت سے کھاتے ہیں اور اگر وہ کسی مصلحت سے غذا میں تقلیل بھی کرتے ہیں تو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک چپاتی یا دو چپاتی کھایا کرتے تھے مگر کھانے پر سے سب کے ساتھ اٹھتے تھے تا کہ دوسروں سے پہلے اُٹھنے میں کسی کو پتہ نہ چل جاوے کہ بہت کم کھاتے ہیں اور چپاتی (۲) کی شمار کون کرتا ہے۔

کمال بزرگی

صاحبو! کمالات حقیقیہ یہ ہیں کہ جنکی کوئی خاص امتیازی صورت نہ ہو اور مصنوعی صورت سے بالکل خالی ہوں۔ غرض کمال بزرگی کی شان عدم امتیاز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بھی یہی تھی کہ کوئی امتیاز نہ تھا چنانچہ کھانے کی حالت یہ تھی کہ لا یعیب شیئا ان اشتھاہ اکلہ وان لم یشتہ لم یأکلہ کہ آپ کسی شئی میں عیب نہیں نکالتے تھے اگر خواہش ہوتی تو تناول فرمالیا ورنہ چھوڑ دیا نہ یہ تھا کہ اگر مرغوب طبع نہ ہو تو برائی بیان کرنا شروع کر دیں نہ یہ تھا کہ زبردستی اس کو کھاویں بلکہ اگر خواہش ہوتی تو تناول فرمالیتے ورنہ چھوڑ دیتے یہ اعتدال ہے اور اعتدال ہی (۳) بہت مشکل ہے اور اعتدال پر چلنا اور حالت معتدلہ پر قائم رہنا سخت کٹھن (۴) راستہ ہے کہ پل صراط کی طرح باریک ہے (۵) اس میں کسی قسم کا حظ نفس (۶) نہیں اور نہ کوئی خاص امتیازی حالت ہے۔ آجکل یا تو افراط کرتے ہیں کہ کھانا مرغوب (۷) نہ ہو تو اس میں عیب نکالتے ہیں یا تفریط کرتے ہیں کہ باوجود عدم رغبت کے مَر مار کر اس نیت سے کھاتے ہیں تا کہ کوئی اعتراض نہ کرے کہ بہت نخرے باز ہیں بلکہ لوگوں میں خوب مدح (۸) کریں کہ بڑے بے نفس ہیں۔ غرض مسنون طریقہ تو یہ تھا جو مذکور ہوا مگر ہم لوگوں کی عجیب حالت

(۱) ایک قسم کا میٹھا پلاؤ جس میں لیموں کی ترشی ڈالی جاتی ہے (۲) توے پر باریک پکی ہوئی روٹی کون گن سکتا ہے (۳) میانہ روی (۴) میانہ روی پر قائم رہنا بہت مشکل ہے (۵) پل صراط بال سے زیادہ باریک ہے (۶) نفسانی لذت نہیں (۷) پسندیدہ (۸) لوگوں کے سامنے خوب تعریف کریں۔

ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ تو ہمیں کھانے کو دیتے ہیں اور ہم لوگ عیوب نکالنے میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس میں نمک کم ہے یا مرچ زیادہ ہے لذت نہیں ذائقہ درست نہیں گرم مصالحہ کی خوشبو نہیں ہلدی کی بو آتی ہے وغیرہ ذالك۔

ہماری ذمہ داری

حالانکہ ہمارے ذمہ یہ حق ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر حال میں شکر ادا کریں اور جب ہمارے ذمہ یہ حق ہے تو پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہمارے عیوب نہ نکالنے پر اجر ملے کیونکہ ہم نے اپنے ذمہ کے حق کو ادا کیا تو اس پر استحقاق اجر کیسا پس مواخذہ سے بچ گئے یہی بڑی بات ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی کے گھر میں آ کر رہے اور مہمانی کے طور پر قیام کرے رخصت کے وقت میزبان سے کہے کہ میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تمہارے مکان میں آگ نہ لگائی۔ واقعی یہ شخص احمق ہے اس کو آگ لگانے کا کیا حق تھا جو نہ لگانے پر شکریہ کا طالب ہے کس بات کا شکریہ ادا کیا جاوے بلکہ مہمان کے ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ میزبان کے مکان کو خراب نہ کرے۔ تو پھر حق واجب کے ادا کرنے پر شکریہ کا استحقاق کیسے ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کھانے میں عیوب نہ نکالنے پر عقل کا مقتضا(۱) تو یہ ہے کہ ہم بھی ثواب کے مستحق نہ بنیں مگر حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ باوجودیکہ ہمارے ذمہ عیب نہ نکالنا ضروری اور لازمی ہے لیکن ہم کو اس پر بھی اجر اور ثواب عنایت فرماتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی قدردانی

چنانچہ ہمارے ایک استاد تھے ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت سادہ اور پاک طینت بزرگ تھے۔ میں نے انتقال کے بعد ان کو خواب میں دیکھا دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بخشدیا، میں نے پوچھا کہ کس بات پر بخش دیا جواب دیا کہ میں ایک مرتبہ گھر میں آیا اور کھانا کھانے بیٹھا کھچڑی میں نمک ٹھیک نہ تھا مگر میں نے کچھ کہا نہیں اور کوئی عیب نہ نکالا اُسی طرح کھانا کھالیا۔

(۱) عقل کا تقاضہ

حق تعالیٰ کے یہاں میرا یہ معاملہ پیش ہوا اس پر میری مغفرت ہوگئی۔ اللہ اکبر غور کیجئے کہ یہ بھی کوئی بڑی بات تھی جس پر مغفرت ہوئی۔ حق تعالیٰ بڑے قدردان ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مغفرت فرماتے ہیں دیکھئے صرف کھانے میں عیب نہ نکالیں پر مغفرت ہوگئی حالانکہ اس نعمت کا ہمارے ذمہ خود ہی یہ حق تھا کہ ہم اس میں عیب نہ نکالے مگر حق سبحانہ کی قدر تو دیکھئے کہ اس پر بھی ہم کو ثواب عطا فرماتے ہیں اور ثواب بھی اتنا کہ صرف اسی وجہ سے مغفرت فرمادی حق تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔ صاحبو! ذرا غور وخوض سے کام لیجیے تو صاف معلوم ہو کہ ہم پر ان کی کس قدر بے شمار نعمتیں ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ تو ہم کو نعمتیں عطا فرمادیں اور ہم عیوب نکالنے پر کمر بستہ ہیں۔

لوگوں کی حالت زار

چنانچہ ہمیں کپڑا پہننے کو ملتا ہے مگر اس کی پسندیدگی میں بھی ہزار ہا قسم کے نخرے ہیں۔ پھر سلواتے ہیں تو اس میں بھی شکن اور جھول کی شکایت ہے کہ اس میں تو جھول پڑ گیا مگر افسوس کہ اس کا اصلاً اور مطلقاً خیال نہیں کہ اس سے ہمارے دین میں جھول پڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کہیں سے کھانا آیا تو اس میں عیب نکال کر واپس کر دیا۔ ایک شخص نے تو روپیہ خرچ کر کے بھائیوں کو کھانا کھلایا مگر ادھر یہ حضرت ہیں کہ اینٹھ گئے چنانچہ میرے اعزہ میں ایک شخص ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھے یعنی سب انسپکٹر تھے وطن آ کر ایک تقریب میں برادری کی دعوت کی مگر ایک شخص آنکھوں سے اندھے کپڑوں سے میلے کچیلے روٹھ گئے اور تماشا یہ کہ وہ معزز رئیس دوپہر کے وقت دھوپ میں اُن کے منانے اور راضی کرنے کے واسطے چلے گو دھوپ اور طپش کے باعث مسجد میں بھی نہیں جاتے تھے مگر ان کے منانے کو دوپہر کو دھوپ میں بے تکلف چلے جا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے منانے کو کبھی مسجد میں نہیں گئے۔ ہماری بھی عجیب حالت ہے حالانکہ وہ صاحب اپنے عہدہ پر ایسے شکستہ حال اور کم حیثیت لوگوں سے بات بھی نہ کرتے ہوں گے مگر تقریب کی شان باقی رکھنے کو سب کچھ گوارا کیا۔ ایک اور شخص ذی ثروت (۱) کا ایسا ہی واقعہ ہے جو ہمارے

(۱) مال دار آدمی۔

وطن میں ہوا کہ شادی کی رسم میں کنبہ برادری کی دعوت کی، برادری میں ایک غریب آدمی کو بڑا حسد ہوا کہ اس کو اس قدر وسعت کیوں ہوئی جو اس نے دعوت کی، آخر کار ایسے موقع کے منتظر رہے کہ اُس موقع پر اُس ذی ثروت کو ذلیل کیا جائے۔ حق تعالیٰ سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ شیطان جیسے لعین کی بھی مرادیں پوری کردیتے ہیں چنانچہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سقہ کارخانہ میں پانی لے جارہا تھا اتفاق سے اس کی مشک میں سوراخ تھا اس میں سے پانی کی پھوار اُن پر جا پڑی فوراً ہی بگڑ گئے اور مجلس سے کھڑے ہوکر کہنے لگے کہ کھانا کھلاتا ہے یا ذلیل کرتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے کہ لوگوں کو پانی میں نہلادے۔ کھلانے کا سلیقہ نہیں اوچھوں کی طرح کھلانے کو تیار ہوگیا۔ ان کے اُٹھنے سے اور دس پندرہ آدمی معیت میں اُٹھ گئے۔ صاحب دعوت نے معافی چاہی کہ بھائی صاحب خدا کے واسطے معاف کردیجئے بہت خوشامد درآمد کے بعد مزاج کی اصلاح ہوئی یہ تو مقصود ہی تھا۔ کہ رئیس کی ہیٹی (۱) ہومگر رئیس کی کیا ہیٹی ہوئی ان کی تو وعظ میں تعریف ہورہی ہے ہاں اُن حاسد صاحب کی ہی ہیٹی ہوئی کہ وعظ میں ان کی تنقیص (۲) ہورہی ہے۔

ناپسندیدہ لوگ

صاحبو! تکبر خدا کو پسند نہیں بالخصوص غریب آدمی سے تو بہت ہی زیادہ ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ تین شخصوں کو بہت مبغوض رکھتے ہیں (۳) ایک وہ جو بوڑھا ہوکر زنا کرے، دوسرے وہ جو بادشاہ ہوکر جھوٹ بولے، تیسرے وہ جو غریب ہوکر تکبر کرے فرعون بے سامان ہوجاوے۔ ایک فرعون باسامان بھی تھا لیکن اگر ان کے پاس سامان ہوتا تو ابلیس (۴) سے کم نہ ہوتے۔ غرض بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں بھی ناگوار ہیں وہ تو نعمتیں عطا فرماتے ہیں اور یہ اوپر سے نخرے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں نخرہ ہے ناک مارے (۵) کوئی شئے پسند ہی نہیں۔ ہر چیز میں عیب وشکوہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گو حق تعالیٰ کی نعم کثیرہ اور بے شمار ہیں مگر زیادہ وہ

(۱) بے عزتی ہو (۲) برائی (۳) ناپسند کرتے ہیں (۴) شیطان (۵) ایسے نخرے ہیں کہ کوئی چیز پسند ہی نہیں۔

حالتیں پیش آتی ہیں جو موافق مزاج اور مناسب طبع نہیں۔

انتخاب آیت کی وجہ

اس وقت ضبط واستقلال کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی معنی ہیں صبر کے اسی واسطے اس آیت کو اختیار کیا گیا کہ اس آیت میں مضمون صبر کو قصہ کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے اور قصص سے مقصود اصلی واقعات کا سنانا نہیں بلکہ ترغیب یا ترہیب (۲) مقصود ہوتی ہے کہ ہم بھی اگلے لوگوں کی حالت محمودہ (۲) کو دیکھ کر عمل کی کوشش کریں اور مذمومہ (۳) کو دیکھ کر اُس سے احتراز کریں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (۴) اور عبرت کے معنی ہیں قیاس (۵)۔

حق تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کا ظہور

پس حق تعالیٰ اس آیت میں والدہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاتی رہو۔ فرعون کو کاہنوں اور نجومیوں نے یہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا فرعون نے یہ پیشین گوئی سن کر بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہوتا اس کو قتل کرنا شروع کر دیا اُسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو حق تعالیٰ نے والدۂ موسیٰ علیہ السلام کو شر فرعون (۶) سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتلائی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ ہر چند کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ولادت موسویہ سے پہلے ان کی والدہ کو حق تعالیٰ کا الہام یوں ہوجاتا کہ سفر کر کے مصر سے باہر ایسی جگہ چلی جاؤ جہاں فرعون کی سلطنت نہ ہو اور جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوجاتے تب مصر میں تشریف لے آتے جیسا کہ جوان ہونے کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام فرعون سے خائف ہوئے تو مدین کی طرف چلدیئے اور شعیب علیہ السلام سے ملے۔ ﴿وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ﴾

(۱) شوق دلانا یا خوف دلانا (۲) اچھی حالت (۳) بری حالت (۴) ان کے قصہ میں سمجھداروں کے لیے عبرت ہے۔ سورۂ یوسف: ۱۲/۱۱۱ (۵) اپنے حال کو اُن کے حال پر قیاس کرنا خواہ انکا حال محمود ہو یا مذموم ہو۔ حال نفسہ علی حالہم سواء کان محمودا او مذمومًا (۶) فرعون کے شر سے۔

قَالَ لَا تَخَفْ ۖ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾(۱) اور شعیب علیہ السلام سے تمام قصہ بیان کیا تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اب خوف نہ کرو، قوم ظالمین سے تم نے نجات پالی۔ کیونکہ مدین میں فرعون کی سلطنت نہ تھی اس وقت موسیٰ علیہ السلام سرحد قریب سے نکل گئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی ایک طریق مفید تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو مصر سے سفر کرنے کا الہام ہوجاتا کہ مدین چلی جاؤ اور موسیٰ علیہ السلام وہیں پر پیدا ہوتے مگر خدا تعالیٰ کو یہ دکھلانا تھا کہ ہم خدا ہیں، مصر میں ایسی حالت میں پیدا کیا کہ فرعون ہر بچہ کے قتل پر کمر بستہ تھا پھر فرعون کے ہاتھوں میں پلوایا تو اپنی قدرت پر استدلال بتلانا ہے نیز یہ بھی بتلانا ہے کہ اتنی بڑی قدرت ظاہر ہونے پر بھی فرعون دعویٰ خدائی سے باز نہ آیا واقعی دل پر مہر ہی ہوچکی تھی حق تعالیٰ فرماتے ہیں: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲) اور فرماتے ہیں: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ (۳) الی قولہ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ (۴) چنانچہ قدرت عظیمہ کا ظہور اس طرح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ہاتھ سے کرائی۔ مخلوق میں کوئی کتنا ہی بڑا قاہر اور زبردست کیوں نہ ہو اپنے محبوب کو دشمن کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دیتا گو دشمن کو کیسا ہی اور کتنا ہی مغلوب وعاجز کردے مگر یہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں یہ میرے بچہ کو قتل نہ کردے، اذیت نہ پہنچادے۔ مگر یہ خدا ہی ہے جس کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو جس کو اپنی قدرت کا علم جازم ہو(۵) کہ بدون ہماری مشیت(۶) کے کسی کی مجال نہیں جو کچھ بھی کرسکے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام جیسے اپنے محبوب کو دشمن کے ہاتھ میں دیدیا اور ایسے وقت میں دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کچھ بھی نہ کرسکتے تھے اور ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلاسکتے تھے اور جب دو تین برس میں ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل ہوئے تو ایسا فعل صادر کرایا جس سے خواہ مخواہ فرعون کو شبہ ہوجاتا کہ یہ لڑکا وہی ہے جو میرا دشمن ہوگا۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک بار فرعون کی گود میں تھے وہ آپ کو پیار کررہا تھا تو آپ نے فرعون کے منہ پر طمانچہ رسید کیا اور اس کی داڑھی نوچ لی۔ فرعون کو

(۱) القصص: ۲۸/ ۲۵ (۲) مہر لگادی اللہ نے اُن کو دلوں پر۔ البرۃ: ۲/ ۷ (۳) آج ہم اُن کے مونہوں پر مہر لگادیں گے۔ سورۂ یٰسین: ۳۶/ ۶۵ (۴) اور اگر ہم چاہتے تو اُن کی صورتیں بدل ڈالتے۔ سورۂ یٰسین: ۳۶/ ۶۷

(۵) پختہ علم (۶) بغیر ہمارے چاہے۔

اس کی سہار(۱) کہاں تھی اس نے تو ہمیشہ وہی تعظیم وتکریم دیکھی تھی ہمیشہ نعمتوں میں رہا اور انسان کے لیے ایسی نعمت بھی بلا ہے۔ فرعون نے بلا نہ دیکھی تھی اور جب تک انسان کو کچھ چرکہ(۲) نہ لگے اس وقت تک اُسے اپنی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا انسان کے واسطے چرکہ لگنا اور کسی مصیبت میں پڑنا جڑ ہے تمام محاسن اور خوبیوں کی۔ فرعون تو تمام عمر ناز ونعمت میں رہا تھا اُس نے کوئی رنج اور تکلیف نہ دیکھی تھی اس لئے اپنے کو سب سے بڑا سمجھتا تھا۔

اپنے کو کمتر سمجھو

جیسے بعض مسلمان بھی اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے اچھے ہیں اور یہ واقع میں بہت بڑا مرض ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مومن مومن نہیں ہوسکتا جب تک کافر فرنگ سے اپنے کو بدتر نہ سمجھے۔ شاہ جی توکل شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کو کتنے سے بھی بدتر سمجھنا چاہئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی توجیہ میں فرمایا کہ کتّے میں اندیشہ بے ایمانی کا نہیں اور مسلمان کو بے ایمانی کا اندیشہ ہے اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ اپنے کو اس اعتبار سے کتّے سے بھی بدتر سمجھے۔ حقیقت میں زندگی ختم ہونے تک انسان کو کچھ حق نہیں اپنے کو اچھا سمجھنے کا رات دن تبدیل وتغیر ہوتی رہتی ہے کوئی آج عابد زاہد ہے اور کل کو شیطان ہوجاتا ہے۔ کوئی آج مسلمان ہے اور کل کو کافر ہوجاتا ہے کوئی آج کافر ہے اور کل کو مسلمان ہوجاتا ہے اس لئے زندگی میں اپنے کو کسی سے اچھا سمجھنے کا کچھ حق نہیں۔ ہاں مرنے کے بعد اگر اسلام پر خاتمہ ہوگیا تو جو کچھ چاہے سمجھ لینا اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گہہ رشک برو فرشتہ برپا کی ما　　گہہ خندہ زند دیوز نا پاکی ما
ایمان جو سلامت بہ لب گور بریم　　احسنت بریں چستی وچالاکی ما (۳)

ایک شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے جواب دیا کہ مرنے کے بعد قبر میں جائز ہے جب یہ اطمینان ہوجاوے کہ ہماری حالت یزید سے اچھی ہے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج اس پر لعنت کریں اور کل کو ہماری حالت

(۱) برداشت (۲) تکلیف نہ پہنچے (۳) ”کبھی تو فرشتہ بھی میری پاکی پر رشک کرتا ہے اور کبھی شیطان بھی میری ناپاکی پر ہنستا ہے اگر قبر تک اپنے ایمان کو صحیح سلامت لے گیا تو پھر میری اس چستی وچالاکی پر آفرین ہے“۔

اُس سے بھی بدتر ہوجاوے تو یزید کہے گا کہ سبحان اللہ آپ دنیا میں کس سرخروئی کی بناء پر مجھ پر لعنت کیا کرتے تھے اب گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھو۔ کسی کو کانا وہ شخص کہے جس کو اپنے اندھے ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر یزید بُرا تھا تو اس کا کیا اطمینان ہے کہ ہم اُس سے اچھے ہو کر مریں گے۔ میاں بس زندگی میں تو روتے ہی رہو۔ حضرت رابعہ بصریہ شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ جس قدر وقت لعنت میں صرف کیا جاوے اس سے بہتر یہ ہے کہ یہ وقت ذکر محبوب ہی میں صرف کیا جاوے۔ ہر چند کہ شیطان پر تبرّا(۱) جائز ہے مگر بزرگ اس کے درپئے نہیں ہوتے کیونکہ مرنے تک اپنا ہی کچھ پتہ نہیں پھر ضروری ہی کام میں کیوں نہ لگے جیسا حضرت رابعہ نے فرمایا۔ اس لئے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کسی کو حق نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا امتحان

اکثر یہ بلا اہل تنعم کو ہوجاتی ہے چنانچہ فرعون کی حالت اسی لئے خطرناک تھی کہ اُس نے بلا اور بے تعظیمی کبھی دیکھی نہ تھی اسی لئے اس نے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۲) کا دعویٰ کیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کی داڑھی نوچ لی تو فرعون غصہ سے بے تاب ہوکر کہنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ وہی بچہ ہے جو میری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اور اس قسم کی واہی تباہی باتیں ہانکنے لگا اور آمادۂ قتل ہوگیا حضرت آسیہؓ کہنے لگیں کہ تم بیوقوف ہوگئے ہو یہ تو ناسمجھ بچہ ہے۔ اس نے اپنے فہم کے مطابق ناسمجھی سے یہ فعل کیا ہے بچہ میں سمجھ کہاں ہوتی ہے جو وہ کوئی کام سمجھ کر کرے فرعون بولا ہرگز نہیں یہ بچہ ناسمجھ نہیں ہے اس نے دانستہ یہ فعل کیا ہے حضرت آسیہؓ نے اس کی نفی کی تو فرعون نے کہا کہ اچھا میں اس کی فہم وعدم فہم کا امتحان کرتا ہوں ایک طشت آگ کا اور ایک طشت جواہرات کا (۳) منگوایا اور دونوں موسیٰؑ کے سامنے رکھدیئے کہ اگر یہ ناسمجھ ہیں تو آگ اور جواہرات کو یکساں سمجھیں گے ورنہ جواہرات کی طرف میلان کریں گے۔ یہ بھی فرعون کی حماقت تھی کیونکہ جب بچہ میں عقل نہیں ہوتی تو اتفاقاً جس طرح بھی چاہے متوجہ ہوجاوے مگر موسیٰ علیہ السلام

(۱) برا بھلا کہنا (۲) میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں (۳) ایک تھال میں انگارے اور دوسرے میں جواہرات منگائے گئے۔

سمجھدار تھے وہ سمجھ گئے کہ آگ قابل توجہ نہیں چنانچہ جواہرات کے طشت کی طرف ہاتھ دوڑانا چاہا مگر جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ان کا ہاتھ آگ کی طرف پھیر دو چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر آگ کے طشت کی طرف منہ پھیر دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے صرف ہاتھ ہی میں نہیں لئے بلکہ منہ میں رکھ لئے جس کی وجہ سے زبان میں لکنت ہوگئی۔ یہ قصہ مستدرک حاکم جلد ثانی کتاب التاریخ ذکر موسیٰ علیہ السلام میں مفصل مذکور ہے من قولہ فبینا ھو یلعب بین یدی فرعون الی قولہ وکان امر بقتلہ ورواہ مختصرا فی الدر المنثور سورہ طٰہٰ براویت عبدبن حمید وابن المنذروابن الی حاتم عن سعید بن جبیر اھ گر بقول مشہور بعد نبوت کے یہ لکنت جاتی رہی تھی۔ بعضوں نے کہا ہے کہ نبوت کے بعد بھی خفیف اثر باقی رہا تھا اور زیادہ اثر زائل ہوگیا تھا جس سے بات سمجھ میں آنے لگی تھی اب فرعون کا اطمینان ہوگیا کہ بچہ نے میرے ساتھ بھی یہ حرکت ناسمجھی سے کی ہے اور پھر شفقت ومحبت بدستور کرنے لگا۔ ایک حرکت تو بچپن میں یہ کی۔ اور بڑے ہوکر یہ کیا کہ ایک قبطی آدمی کو مار ڈالا فرعون نے اس قصہ کو سن کر وارنٹ گرفتاری کا نکالدیا، اشتہار دیدیا کہ موسیٰؑ جہاں ہوں پکڑ لئے جائیں موسیٰؑ کو جب یہ معلوم ہوا تو مصر سے سفر شروع کردیا اور تن تنہا بلا کسی رہبر کے مصر سے روانہ ہوگئے۔ انبیاء علیہم السلام کو تمام امور من جانب اللہ سہل ہوجاتے ہیں چنانچہ باوجود اس کے کہ راستہ معلوم نہ تھا کبھی سفر نہ کیا تھا مگر خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرکے چل پڑے اور کامیاب ہوگئے۔ توکل کی یہی برکت ہے متوکل کے ساتھ بے دست وپا بچوں کا سا معاملہ کیا جاتا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

طفل تا گویا وتاپویا نہ بود مرکبش جز گردن بابا نبود(۱)

جب آدمی خدا تعالیٰ کے بھروسہ کام شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی مدد ساتھ ہوتی ہے اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے دارالکفر سے ہجرت کی تھی۔

(۱) ''بچہ جب تک چلنے پھرنے اور بات کرنے کے قابل نہ ہو باپ کی گردن ہی اس کی سواری ہوتی ہے۔

توکل کی حقیقت

جاہل آدمی یہ سمجھے ہوں گے کہ موسیٰؑ بھاگے بھاگے پھرے اور خلاف توکل کام کیا حالانکہ موسیٰؑ کا مصر سے چلا جانا خلاف توکل نہیں تھا بلکہ واقع میں بہت بڑا توکل ہے۔ تقریر مقام کی یہ ہے کہ اختیار تدبیر کامل یا ترک تدابیر مطلقاً کے متعلق توکل کے اقسام واحکام تو قوم میں مشہور اور کتب قوم میں مفصّلاً مذکور ہیں مگر تدبیر ناقص کے اختیار کرنے کا حکم اور درجہ غالباً کم معلوم ہے اس لئے اس کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ کہ اس کو عام طور سے ظاہر نظر میں یہ دیکھ کر کہ تدبیر تو اختیار کی توکل نہیں سمجھا جاتا اور یہی منشاء شبہ بالا کا ہوا حضرت موسیٰؑ کی نسبت۔ مگر واقع میں تدبیر کے ضعیف اور ناکافی ہونے کی صورت میں ایسی تدبیر کے ترک کی نسبت اُس تدبیر کے اختیار کرنے میں زیادہ توکل ہے عنقریب اس کی توجیہ آتی ہے۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے جس تدبیر کو اختیار کیا وہ اس لئے ناکافی تھی کہ ظاہر الفاظ آیت ﴿ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۱) اور آیت ﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾(۲) سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ کو راستہ مدین کا معلوم نہ تھا نہ کسی سے پوچھنا منقول ہے محض حق تعالیٰ سے دعا اور کسی مامَن (۳) کا راستہ مل جانے کی رجاء (۴) پر سفر شروع فرمادیا جس کی برکت سے مدین کی طرف قدرتی طور پر رخ ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ تدبیر نجات کی محض ناکافی تھی۔ اب حسب وعدہ ایسی تدبیر کے اختیار کرنے میں زیادہ توکل ہونا بیان کرتا ہوں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو عام لوگ اس کو توکل نہیں سمجھتے جیسا شروع تقریر میں مذکور ہوا تو بوجہ خفی ہونے کے اس میں زیادہ اخلاص ہے۔ دوسرے اس کا اختیار کرنا محض عبدیت ہے کہ باوجود ناکافی ہونے کے امتثال امر سمجھ کر اس کو اختیار کیا۔ طبع وعادت کی مزاحمت پر عمل نہیں کیا تیسرے اس صورت میں حق تعالیٰ کی قدرت کے مؤثر ہونے پر یہ نظر ہونا

(۱) ''پس موسیٰ وہاں سے نکل گئے خوف اور دہشت کی حالت میں کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا'' سورۃ القصص: ۲۸/۲۱ (۲) ''اور جب موسیٰ مدین کی طرف ہولئے کہنے لگے کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو سیدھے راستہ چلادیگا'' سورۃ القصص: ۲۸/۲۲ (۳) پناہ گاہ (۴) امید۔

(کہ وہ غیر موثر کو مؤثر کر سکتے ہیں) عجیب ہے بخلاف ترک کے کہ اُس صورت میں اگر قدرت پر نظر نہ ہوگی اور کس چیز پر ہوگی، اس لئے یہ توکل اکمل واقویٰ ہے۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کا ایسی حالت ناواقفی میں بلا دریافت کئے سفر کرنا ظاہراً تو تدبیر پر عمل ہے مگر واقع میں نہایت کامل اور دقیق توکل ہے اگرچہ ظاہر میں تدبیر کی تھی مگر یہ تدبیر بھی جبکہ راستہ وغیرہ معلوم نہ تھا ناقص تھی اس لئے یہ تدبیر محض برائے نام تھی ورنہ حقیقت میں پورا توکل تھا۔ البتہ آپ نے عام مذاق کی موافق توکل نہیں کیا کہ وہاں سے سفر ہی نہ کرتے بلکہ اپنی امکانی تدبیر بھی کی گو نام ہی کی تدبیر تھی۔ اور توکل بھی کیا اور یہ سخت مشکل ہے کہ ایسی حالت میں تدبیر اور کوشش بھی کرے جبکہ تدبیر کی بظاہر کافی صورت نہ ہو ورنہ ایسی حالت میں طبعی اقتضا مطلقاً ترک تدبیر ہے تو حق تعالیٰ کی قدرت پر نظر کر کے طبیعت کو مغلوب کرنا بڑا مجاہدہ ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا توکل

اسی کی نظیر حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ جب وہ زلیخا کے ہاتھ میں آ گئے اور مکانات میں مقفل ہو گئے (۱) اور مکان بھی سات درجوں کا تھا تو اس وقت توکل ظاہری تو یہ تھا کہ وہاں سے نہ اٹھتے اور تدبیر کامل یہ تھی کہ کنجی پاس ہوتی تو بھاگ کر کھول لیتے کیونکہ وہ قفل کوئی معمولی قسم کے نہ تھے کہ ہاتھ کے زور سے ٹوٹ جانے کی توقع ہوتی غایت درجہ کے مضبوط قفل تھے اس صورت میں ظاہر بین کو خواب میں بھی تدبیر کا خیال نہیں آ سکتا کیونکہ کنجیاں پاس نہیں اور قفل معمولی کمزور نہیں اب تدبیر کے تو کس بھروسہ پر کرے۔ مگر یوسف علیہ السلام کو ہم سوالوں (۲) کی طرح وساوس نہ آتے تھے کہ قفل کس طرح کھلے گا (۳)۔ بس انہوں نے یہ سوچا کہ مجھ کو یہاں سے بھاگنا چاہئے میرا اتنا ہی کام ہے آئندہ قفل کھولنا حق تعالیٰ کا کام ہے مگر یہ ظرف (۴) یوسف علیہ السلام کا تھا اور یہ نبوت کی قوت تھی جو اُن کو یہ خیال آیا کہ میں تو یہاں سے بھاگوں میرا کام اتنا ہی ہے آئندہ حق تعالیٰ شانہ کا کام ہے قفل کا کھولنا نہ کھولنا۔ غیر نبی کو اس حالت

(۱) بند ہو گئے (۲) ہم جیسوں (۳) تالہ کس طرح کھلیگا (۴) یہ حوصلہ۔

میں بھاگنے کا کبھی خیال نہ آسکتا تھا یہ کام نبی ہی کا تھا۔ چنانچہ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی پر دروازہ کی طرف دوڑ پڑے اور قفل ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے زلیخا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مولانا مثنوی اسی مضمون کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید خیرہ یوسف وارمی باید دوید(۱)

مقصود مولانا کا یہ ہے کہ قیود نفسانیہ (۲) سے نکلنے کی اپنی قدرت بھر کوشش کرو آئندہ حق تعالیٰ مالک ہیں ان کے سپرد کردو۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کا کمال دیکھئے کہ بے خبری (۳) ہی کی حالت میں مصر سے نکل کر مدین کی طرف کو روانہ ہوگئے اور رحمت حق سے مایوس نہیں ہوئے اور نہ راستہ کی ناواقفیت سے پریشان ہوئے۔ ہم سوالوں (۴) کا تو یہ حشر ہوتا کہ ناامید ہوکر رہ جاتے کہ کدھر جائیں مگر موسیٰ علیہ السلام سیدھے ایک طرف کو روانہ ہوگئے اور فرعون کے قبضہ سے نکل گئے جس پر فرعون ساری عمر دانت پیستا رہا کہ میرے قبضہ سے کیونکر نکل گئے اس وقت فرعون کی ایسی مثال ہوگئی کہ ؎

در بہ نسبت ودشمن اندر خانہ بود حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود(۴)

غرض عمر بھر فرعون کے ہاتھ میں رہنے کے بعد مہالک سے(۶) اس طرح نجات پائی اور فرعون کے ہاتھ میں آنے سے پیشتر مہالک(۷) سے جس طریق سے نجات پائی تھی وہ بھی اسی طریق سفر مدین کے ہمرنگ (۸) تھیں کیونکہ کسی بچہ کی نجات کی یہ شکل کہ اس کو صندوق میں بند کرکے دریا میں پھینک دیا جائے بظاہر نہایت ہی ضعیف وناکافی تدبیر ہے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان اسی معاملہ کے مناسب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا عجیب انداز حفاظت

اسکا قصہ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے جس کی میں نے خطبہ میں تلاوت کی

(۱) ''اگرچہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح مقدور بھر کوشش کرنی چاہئے'' (۲) اپنی بساط کے مطابق نفس کی قید سے آزاد ہونے کی سعی کرو (۳) راستہ سے ناواقف ہونے کے باوجود (۴) ہم جیسوں کا (۵) ''یعنی دروازہ بند کردیا کہ چور نہ آئے اور چور اندر گھر کے موجود ہے فرعون نے ہزار ہا تدابیر کیں مگر دشمن کا پتہ ہی نہ چلا'' (۶) نقصان پہنچانے والی قوتوں (۷) فرعون کے قبضہ میں آنے سے قبل نقصان پہنچانے والی قوتوں سے نجات پائی (۸) مدین کے سفر کی مانند تھیں۔

ہے ﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾(۱) آخر آیت تک ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی یعنی الہام کیا کہ موسیٰ کو دودھ پلاؤ۔ آگے اُن کے چھپا دینے کے لیے دریا میں ڈال دینا مذکور ہے۔ اور اسی اخفاء کے لیے یہ سامان فرمایا گیا کہ جب پیدا ہوئے تو موسیٰؑ روئے نہیں تا کہ اخفاء(۲) کی ظاہری تدبیر بھی پوری ہوجاوے۔ حق تعالیٰ کی بھی عجیب شان ہے کہ کہیں تو ظاہری اسباب اور تدبیر بھی استعمال فرماتے ہیں اور کہیں استعمال نہیں فرماتے اور ہر ایک میں حکمتیں ہوتی ہیں غرض یہ وحی ہوئی کہ دودھ پلا دیں اور جب اندیشہ ہو کہ فرعون کو بچہ کا پتہ چل جاویگا اس وقت اس کو دریا میں ڈالدینا بچاؤ کی تدبیر بھی ایسی بتلائی کہ اس کو کوئی تدبیر ہی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر دریا سے فرعون کے ہاتھ آجاویں تو اندیشۂ قتل ورنہ دریا میں ڈوب جاویں۔ اور دریا میں ڈالنے کی صورت یہ فرمائی کہ صندوق میں رکھ کر پھینکنا چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ (۳) غرض جب تک دریا میں رہے اس وقت تک مہالک(۴) ہی کے ذریعہ سے دریا میں نجات دی یعنی مہالک کو سبب نجات(۵) بنادیا اور والدۂ موسیٰ کی تسلی کے لیے یہ فرمادیا کہ دریا میں ڈال کر رنجیدہ اور خائف(۶) نہ ہونا ہم بیشک موسیٰؑ کو پھر تمہارے پاس بھیج دینگے اطمینان رکھو یہ بھی ظاہر میں بہت بعید بات تھی(۷) اور اسی رنگ کی تدبیر تھی جو صورۃً عدم تدبیر تھی(۸) کیونکہ کہاں تو محل فرعون اور کہاں موسیٰؑ کی والدہ بھلا فرعون کے ہاتھ میں موسیٰؑ کے پہنچ جانے پر پھر یہ خیال کیونکر ہوسکتا ہے کہ ان کی والدہ بھی محلات فرعون میں بلالیئے جائیں گی پھر ارشاد ہے۔

والدہ موسیٰ علیہ السلام کا کمال توکل

وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۹) اور ہم موسیٰ علیہ السلام کو رسول بناویں گے اس آیت میں بشارت ہے موسیٰ علیہ السلام کی درازی عمر کی ۴۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ

(۱) القصص: ۲۸/۷ (۲) پوشیدہ رکھنے کی ظاہری تدبیر (۳) طٰہٰ: ۲۰/۳۹ (۴) ہلاک کرنے والی قوتوں کے ذریعہ (۵) ہلاک کرنے والی قوتوں کو نجات کا سبب بنادیا (۶) خوف زدہ وغمگین (۷) بظاہر ناممکن (۸) ظاہرا یہ کوئی بچاؤ اور حفاظت کی تدبیر نہیں تھی (۱) سورۃ القصص: ۲۸/۷۔

بعادت غالبہ(۱) رسول چالیس سے کم میں نہیں ہوتے یہ حاصل ہے آیت کا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اسی طرح سے صندوق میں بستر بچھا کر اور موسیٰ علیہ السلام کو اس میں لٹا کر بند کر کے دریا میں ڈالدیا یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک عجیب کمال ثابت ہوتا ہے کہ ماں کو اولاد سے ظاہر ہے کہ بیحد محبت ہوتی ہے کہ اذیت کے احتمال بعید بلکہ غیر واقعی سے بھی وہم پیدا ہوتا ہے نسائی کی حدیث میں ہے کہ ایک بچہ کو غسل کے وقت غسّال(۲) سے حضور اقدس کے سامنے اس کی ماں نے یہ کہا تھا کہ میرے بچہ پر زیادہ ٹھنڈا پانی نہ ڈالدینا کبھی سردی سے تکلیف ہو جیسے زندہ بچہ کی حفاظت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی وہ مرنے کے بعد اس کی حفاظت کرتی تھی مگر باوجود اس کے والدہ موسیٰ علیہ السلام ان کو صندوق میں رکھ کر اور صندوق بند کر کے بسم اللہ کہہ کر دریا میں چھوڑ آئیں۔ خدا کے اوپر کیسا وثوق تھا یہ سوال بھی نہیں کیا کہ دریا میں کیا ہوگا اور حق تعالیٰ نے جو کچھ مجملاً فرما بھی دیا تھا ﴿ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ﴾ کہ اسکو میرا اور اس کا دشمن پکڑ لیگا۔ اس پر انہوں نے یہ سوال نہیں کیا کہ دشمن پکڑ کر کیا کریگا اور جو کریگا بہتر ہوگا یا شر(۳) کیسا انقیاد ہے(۴) بس جان لیا کہ یہ میری چیز نہیں مجھے اس قسم کے سوالات کا کوئی حق نہیں جیسے کوئی بادشاہ اپنے خازن(۵) سے کہے کہ اس الماری کی اشیاء کو اس میں سے اٹھا کر اُس الماری میں رکھدو تو خازن(۶) کو یہ منصب نہیں کہ یہ کہے کہ جناب کیوں رکھدوں۔ بلکہ بادشاہ جس طرح چاہے اس کو اُسی طرح کرنا چاہئے۔

ایاز کی فرمانبرداری

جیسے بادشاہ محمود غزنوی کے ایک حکم کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا اس کا واقعہ یہ ہے کہ وزراء نے سلطان محمود سے شکایت کی کہ آپ کو ایاز کے ساتھ تعلق زیادہ ہے اور حضور ایاز کو زیادہ چاہتے ہیں اس وقت تو محمود اس کو سنکر ٹال گیا اور دل میں خیال کیا کہ کسی موقع پر بتلاؤں گا کہ ایاز کے ساتھ زیادہ تعلق کیوں ہے چنانچہ ایک مرتبہ دربار عام

(۱) اللہ تعالیٰ کی غالب عادت یہ ہے کہ چالیس سال سے کم میں رسالت نہیں دیتے (۲) مردہ بچے کو غسل دینے والے شخص سے (۳) وہ اچھا کرے گا یا برا (۴) کس قدر تابعداری ہے (۵) خزانچی (۶) خزانہ کی حفاظت پر مامور شخص کو یہ حق نہیں۔

کیا اور خزانہ میں جو ایک بہت بڑا اور بیش بہا(۱) قیمتی موتی تھا کہ اس کے ساتھ کا اور کوئی موتی خزانوں میں نہ تھا اس کو منگوا کر دربار میں رکھا اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس موتی کو توڑ دو وزیر نے سوچا کہ شاید اس وقت بادشاہ نے کسی حالت کے جوش میں ایسے ہی کہہ دیا ہے بعد میں پشیمان(۲) ہوگا ادب سے عرض کیا کہ حضور یہ تو بے نظیر موتی ہے۔ بادشاہ نے وزیر دوم سے کہا کہ تم توڑ دو۔ وزیر دوم نے بھی یہی سوچ کر کہ جب وزیر اعظم نے نہیں توڑا تو میں کیسے توڑوں۔ وزیر اول کی طرح اس کے بیش بہا اور بے مثل ہونے کا عذر کر دیا بادشاہ نے ایاز کی طرف نظر اٹھائی کہ تم توڑو۔ ایاز نے فوراً دو پتھر اوپر نیچے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیے جب وہ ٹوٹ گیا تو بادشاہ نے نظر غیظ وغضب(۳) سے ایاز کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ کیا کیا ایاز نے کہا کہ حضور قصور ہوا وزراء خوش ہوئے کہ آج ایاز پر بھی خفگی ہوگی اور ہم بڑے عقلمند تھے کہ باوجود امر شاہی کے اپنی عقل سے رک گئے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ بعد میں بادشاہ کو رنج ہوگا(۴)۔

ایاز کا حضرت آدم کی سنت پر عمل

اور ایاز نے جو یہ عرض کیا کہ بندہ سے قصور ہوا حضور معاف فرماویں یہ اس کے مشابہ ہے۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام نے جب گیہوں کھالیا تھا اور حق تعالیٰ کی خفگی ہو کر جنت سے جدا کئے گئے تو انہوں نے بھی یہی فرمایا تھا کہ ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتۃ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾(۵) تو آدم علیہ السلام نے خطا کی نسبت اپنی طرف کی اور اپنے نفس کو خطاوار بتا کر معافی کی درخواست کی برخلاف شیطان کے کہ اس نے خطا کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِي (۶) کہہ کر خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کی اور ادب کو ملحوظ نہ رکھا اگر ادب کو ملحوظ رکھ کر اپنی طرف نسبت کرتا تو اس کی بھی معافی ہو جاتی اسی مضمون کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

(۱) بہت مہنگا موتی (۲) شرمندہ (۳) غصہ بھری نظروں سے (۴) افسوس (۵) ''اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کرینگے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جاویگا'' سورۃ الاعراف: ۷/۲۳ (۶) ''اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے'' الحجر: ۱۵/۳۹۔

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ تو در طریق ادب کوش کیں گناہ من ست (۱)

غرض آدم علیہ السلام نے ادب کو ملحوظ رکھ کر معصیت (۲) کی نسبت اپنی طرف کی اور شیطان نے ادب کو پس پشت (۳) ڈال کر خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کی۔ ادب کی یہ برکت ہوئی کہ آدم علیہ السلام مقبول ہوئے اور شیطان مردود ہوا (۴)۔ شیطان نے تو یہ قول شرارت سے کہا تھا اگر غلبۂ حال میں کہتا تب بھی معافی ہو جاتی۔

شیطان کا عذر لنگ

مگر اس نے تو جیسا بعض اہل سیر (۵) نے لکھا ہے یہی سبب بیان کیا کہ میں نے جو کچھ کیا آپ کے لکھے ہوئے کے موافق کیا۔ مخالفت کیا کی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تجھے اس وقت لکھے ہوئے کی کیا خبر تھی جس کی موافقت کا دعویٰ کرتا ہے تو نے تو معصیت (۶) اور سرکشی ہی کی وجہ سے سجدہ سے انکار کیا آجکل بھی اکثر آدمی نماز نہیں پڑھتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں نماز نہ پڑھنا ہی لکھا ہوا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ نماز کا وقت گذرنے سے پہلے تمہیں کیا خبر ہے کہ تمہاری قسمت میں نماز پڑھنا نہیں ہے تو نہ پڑھنے کا یہ سبب نہیں بلکہ معصیت اور شرارت سبب ہے۔ غرض آدم علیہ السلام سے جب خطا ہوگئی تو معافی چاہی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ ایاز نے بھی آدم علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا۔ کہ جب موتی توڑنے پر بادشاہ خفا ہوا۔

ایاز کا جواب لاجواب

تو بولا کہ حضور خطا ہوئی اور اس کے قبل جب وزراء نے موتی توڑنے پر ملامت کی تو ان سے مخاطب ہو کر یوں کہا تھا کہ میں نے تو موتی ہی توڑا تم نے بادشاہ کا حکم توڑا اور موتی کا توڑنا بادشاہی حکم کے توڑنے سے سہل ہے ؎

(۱) گناہ میں اگرچہ میں اپنے اختیار سے مبتلا نہ ہوا ہوں لیکن ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ میں کہوں یہ میرا گناہ ہے (۲) گناہ کی نسبت (۳) ادب کی رعایت نہیں کی (۴) راندہ درگاہ ہوا (۵) مورخین (۶) گناہ اور نافرمانی۔

نقصِ امر از کس دُر دُشوار تر لاجرم بستم بامراد کمر(۱)

ایاز نے امر کے بعد جو عمل کیا یہی مذاق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا تھا کہ موتی کے وہ مالک ہیں جہاں چاہیں رکھوائیں مجھے چوں وچرا کا کیا حق ہے چنانچہ جس الماری میں رکھنے کا امر کیا گیا انہوں نے اُسی الماری میں رکھدیا جس کا ذکر آئندہ آیت میں ہے۔

عارفین کا مذاق

﴿فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ ﴾(۲) محققین کا مذاق جامع الاضداد ہوتا ہے ان کو اس طرح جامع بنایا گیا کہ تھوڑی سی تدبیر بھی بتلائی کہ توکل کا نام نہ ہو اور ظاہر میں ناقص وناکافی تھی اس لئے توکل بھی کامل ہوا جیسا اوپر بیان ہوا ہے جب دو چیزیں متضاد مجتمع ہوتی (۳) ہیں تو محققین دونوں پر عمل کرتے ہیں اور وہ صورۃً متضاد ہوتی ہیں نہ کہ حقیقۃً توکل محض میں تو ایک شان امتیاز کی ہے اور تدبیر محض میں صورۃً توکل کی مخالفت ہے اس لئے عارفین ایسے موقع میں تدبیر وتوکل دونوں متضاد کو جمع کرتے ہیں البتہ جمع بین المتضادین کا لون (۴) ہر جگہ جدا ہوتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو حضور سے رونا اور آنکھوں سے آنسو بہنا ثابت ہے اور آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ رحمت ہے یعنی جو کہ حق ہے اولاد کا دیکھئے یہاں صبر اور ظہور حزن (۵) دونوں جمع ہوگئے اور بعضے بزرگ جو اولاد کے مرنے پر ہنس پڑے یہ دلیل کمال نہیں۔ کیونکہ یہ دلیل ہے عدم تعلق بالاولاد (۶) کی بلکہ آنسوؤں کا بہنا ہی کمال ہے کہ اس میں جمع ہے دونوں حقوق کا۔

والدہ موسیٰ علیہ السلام کا کمال ضبط

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کمال توکل تو اسی سے معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ نے

(۱) ''بادشاہ کے حکم کو توڑنا میرے نزدیک موتی کو توڑنے سے زیادہ مشکل تھا بادشاہ کے حکم کی بجا آوری کی بناء پر میں نے اس جرم کا ارتکاب کرلیا'' (۲) ''پھر جب تم کو اُن کی نسبت اندیشہ ہو تو اُن وک دریا میں ڈال دینا'' القصص: ۲۸/۷ (۳) جب دو ایسی چیزیں جمع ہو جائیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں (۴) دو متضاد باتوں کو جمع کرنے کا ہر ایک کا طریقہ جدا ہے (۵) صبر اور اظہار غم (۶) اولاد سے تعلق نہ ہونے کی۔

حکم فرمادیا کہ ان کو دریا میں ڈالدو اور انہوں نے خدا پر بھروسہ کرکے فوراً ڈالدیا اب اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ دریا میں ڈال دیتیں اور ڈالکر مایوس ہوکر اور صبر فرما کر فارغ القلب (۱) ہوکر بیٹھ جاتیں مگر حق سبحانہ نے یہ حکم دیکر موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے قلب کا تعلق قطع نہیں ہونے دیا بلکہ واپسی کی خوشخبری اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكَ (۲) میں سنا کر آتش شوق (۳) کو تیز کردیا۔

غرض ایسے سخت مایوس کن حکم کے بعد اُن کے اشتیاق کو بھی باقی رکھا اور اُن کو ترساں وہراساں (۴) بھی نہ ہونے دیا یہ ایسا مشکل ہے جیسا میرٹھ میں ایک شخص تلوار کی دھار سے آنکھوں میں سرمہ لگایا کرتا تھا جب اُس نے تلوار سے سرمہ لگانے کا کمال ظاہر کیا تو کسی نے خوف کی وجہ سے سرمہ نہ ڈلوایا۔ اور یہ کہا کہ پہلے اپنے لڑکے کو سرمہ ڈالو۔ چنانچہ اُس نے اپنی لڑکے کو کھڑا کرکے تلوار میں سرمہ لگا کر پینترا بدلتے ہوئے صاف دونوں آنکھوں میں سرمہ ڈال دیا، خدا جانے کیا غضب کیا کہ دونوں آنکھوں میں صاف سرمہ لگ گیا اور آنکھوں پر کچھ بھی ضرب نہ آئی۔ یہ تو ظاہری کمال ہے کہ حسی تلوار سے سرمہ لگادیا اور یہ حقیقی کمال ہے کہ باطنی تلوار سے سرمہ لگانے کی یہ صورت کی کہ دریا میں بچہ کو ڈلوا کر واپسی کا وعدہ کرکے ترساں وہراساں (۵) نہ ہونے دیا سو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے باطن میں بھی تلوار شوق کی پیدا ہوگئی تھی مگر اس نے کاٹ نہیں کی۔ یہ ہے باطنی تلوار سے سرمہ لگادینا اسی کو فرماتے ہیں اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكَ جس سے اشتیاق کی تلوار کا پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے پھر بھی باوجود ایسی دھاردار تیز تلوار کے از جارفتہ (۶) نہ ہوئی جیسے وہ لڑکا نہیں ہچکچایا اور سرمہ لگوالیا اور ایسے وقت میں جبکہ شوق کا غلبہ ہو مستقل رہنا اور اس کا اخفاء کرنا سخت مشکل ہے۔ مایوس ہوکر صبر کرلینا سہل ہوتا ہے مگر جب ملنے کی امید بھی وابستہ ہوجاوے ادھر اولاد کا تعلق بھی ہو اس وقت ضبط دشوار ہے مگر والدۂ موسیٰ علیہ السلام کامل بشر تھیں اس وقت بھی ضبط فرما گئیں۔ ناقص نہ تھیں کہ قلبی حالت

(۱) بے فکر ہوکر (۲) ''ہم ضرور ان کو پھر تمہارے ہی پاس واپس پہنچادیں گے'' القصص:۷ (۳) شوق کی آگ بھڑکادی (۴) مایوس وخوفزدہ (۵) پریشان اور خوفزدہ (۶) بے قابو۔

ظاہر ہوجاتی چنانچہ صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریا میں چلتا کر دیا اور جب سب کام پورا کرلیا تو آرام سے بیٹھ گئیں آگے اسی مضمون کو فرماتے ہیں ﴿وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۱)

اشکال کا جواب

کسی ظاہر پرست کو اس پر یہ وسوسہ ہوسکتا ہے کہ اس میں والدۂ موسیٰ علیہ السلام کا کیا کمال ہوا تمام اطلاعی امور وحی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے القاء(۲) فرمادیئے اور حق تعالیٰ ہی کے مضبوط کرنے سے وہ حالاً مضبوط ہوگئیں پھر ان کا کیا کمال ہوا۔

جواب یہ ہے کہ بشر کے کمال کے تو معنی یہی ہیں کہ خدا کے مضبوط کرنے سے مضبوط ہوجاوے یعنی خدا تعالیٰ نے کامل کر دیا وہ کامل ہوگیا بغیر مدد خداوندی انسان کوئی کام بھی نہیں کرسکتا جب کمال انسانی کی حقیقت یہی ہے پھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے کمال میں کیا شبہ رہا۔ بہرحال یہاں تک تو شان توکل کا غلبہ ظاہر ہوا۔

موسیٰ علیہ السلام کے لیے حفاظتی تدابیر

اس کے بعد تدبیر شروع کی گئی وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (۳)۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی ہمشیرہ سے کہا کہ تلاش کرو کہ وہ صندوق کہاں گیا وہ تلاش کے لیے نکلیں۔ دریا میں سے نہر کٹ کر فرعون کے محل کو گئی تھی خدا کی قدرت نہر کو حکم ہوا کہ صندوق کو تو اپنے اندر لیجا۔ دریا میں سے صندوق نہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب فرعون کے محل میں پہنچا فرعون نے نوکروں سے کہا کہ یہ صندوق جو سامنے سے بہہ رہا ہے پکڑو چنانچہ صندوق فرعون کے سامنے لایا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ محل میں آتی جاتی تھیں۔

(۱) اور موسیٰؑ کی والدہ کا دل بیقرار ہوگیا قریب تھا کہ وہ موسیٰ کا حال ظاہر کر دیتیں اگر ہم اس کے قلب کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہیں کہ یہ یقین کئے رہیں'' القصص:۱۰(۵) تمام ہونے والے واقعات کی اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام خبر دیدی(۶) ''انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ انکا سرغ تو لگا'' القصص:۱۱۔

فرعون نے صندوق کھلوایا۔ اس میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا جو مع شان خداوندی یعنی محبت کے جو اُن میں حق تعالیٰ نے رکھی تھی آرام فرماتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے : ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾(۱) جس کا یہ اثر تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا عاشق وفریفتہ ہوجاتا تھا۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام صندوق میں لیٹے ہوئے اپنے انگوٹھے کو چوس رہے تھے۔ انگوٹھے میں حق تعالیٰ نے وہ غذا پیدا فرمادی جو ماں کی پستان (۲) میں تھی اس لئے دودھ پیئے ہوئے جس طرح بچہ خاموش پڑا رہتا ہے یوں ہی موسیٰ علیہ السلام خاموش پڑے ہوئے تھے۔ فرعون دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا مگر ظاہر داری کو بولا کہ کہیں یہ وہی بچہ نہ ہو جو میرا دشمن ہوگا اس خطرہ میں بھی حق تعالیٰ نے حقیقت سے غافل نہیں رکھا بلکہ متنبہ کردیا جو بڑی قدرت کی دلیل ہے کہ باوجود کھٹک کے اُن پر قادر نہ ہو جس کا ظاہری سامان یہ ہوا کہ فرعون کی بیوی نے کہا کہ باولے ہوئے ہو (۳) اس درجہ کا تو بنی اسرائیل میں انتظام کررکھا ہے کہ کوئی بچہ زندہ نہ رہنے پائے تو وہ بنی اسرائیل والا بچہ یہ کیسے ہوسکتا ہے نہ معلوم کہاں سے بہتا ہوا آرہا ہے یہ بنی اسرائیل کے خاندان سے نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان کے بچوں پر تو پولیس کا پہرہ ہے اس لئے وہم نہ کرو ہمارے اولاد نہیں اس کو بیٹا بناویں گے۔ فرعون بھی بوجہ محبت مذکورہ کے یہی چاہتا تھا بات سمجھ میں آگئی رضامند ہوگیا حکم دیا کہ اچھا اس کے واسطے انّاؤں (۴) کو بلاؤ کہ دودھ پلاویں۔ چنانچہ انّائیں بلائی گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام مچل گئے (۵) اور کسی کا دودھ نہیں پیا محل کو سر پر اٹھالیا (۶)۔ موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کی چونکہ محل شاہی میں آمدورفت تھی وہ موقع پا کر محل میں گئیں تو دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی کا دودھ نہیں پیتے وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (۷) ان کی ہمشیرہ بولیں کہ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ (۸) یعنی کیا

(۱) اور میں نے تمہارے اوپر ایک اثر اپنی محبت کا ڈالدیا" طٰہٰ :۳۹ (۲) ماں کے دودھ میں تھی (۳) کیا پاگل ہوگئے ہو (۴) دودھ پلانے والی عورتوں کا انتظام کیا جائے (۵) نخرے کرنے لگے (۶) خوب روئے کہ سارا محل پریشان ہوگیا (۷) اور ہم نے پہلے ہی سے موسیٰ علیہ السلام پر دودھ پلانے کی بندش کررکھی تھی۔ القصص:۱۲ (۸) کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتادوں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ اس کی خیرخواہی کریں۔

میں تمکو ایسا خاندان بتلادوں جو اس بچہ کی کفالت کرلیں۔ اور وہ خاندان اسکا خیرخواہ بھی ہو۔ فرعون بولا کہ وہ اس بچہ کے خیرخواہ کیوں ہیں اور ان سے انہیں کیا علاقہ ہے یہ گھبرائیں مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوئی اور جواب ان کی سمجھ میں آگیا کہ ''لہ'' کی ضمیر سرکار کی طرف ہے یعنی وہ لوگ سرکاری خیرخواہیں۔ اچھا ''لہ'' میں لَہُو چٹادیا(۱)۔ فرعون کو چکّر میں لے لیا۔ انبیاء علیہم السلام کے خاندان کے عالی دماغ اور ذہین ذکی ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ فرعون سمجھا کہ یوں ہی ہوگا۔ بولا کہ اچھا اُن کو بلالاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی گود میں واپسی

یہ دوڑی دوڑی اپنی والدہ کے پاس آئیں۔ والدہ نے ان کو دیکھا اول تو اس لحاظ سے کہ خبر لیکر آئی ہوں گی ثانیاً (۲) چہرہ سے مسرت (۳) نمایاں تھی اس لیے دیکھ کر والدہ کی جان میں جان آگئی انہوں نے سارا قصہ بیان کیا تو والدہ وہاں گئیں اور بچہ کو چھاتی سے لگایا تو موسیٰؑ فوراً دودھ پینے لگے پھر تنخواہ کی بات چیت شروع ہوگئی تو انہوں نے لمبی چوڑی تنخواہ کہی اور یہ کہا کہ بچہ کو بھی میں اپنے گھر رکھوں گی میرا یہاں رہنا نہیں ہوسکتا چنانچہ فرعون نے اس شرط کو اسلئے منظور کرلیا کہ دیکھ لیا کسی اور کا دودھ نہیں پیتے اگر وہ فرعون کے گھر رہنا منظور نہ کریں تو دودھ کا کچھ انتظام نہیں اور شرط منظور کرکے کہا کبھی کبھی ہمیں دکھلا جایا کرو۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اپنے گھر پر جی بھر کر بچہ کو دیکھوں گی تنخواہ کی تنخواہ ہوگئی بچہ کا بچہ اپنے پاس آگیا۔ اور عزت وحرمت الگ حاصل ہوگئی کہ بادشاہ کے گھر کا شہزادہ آگیا، یہ عجیب قدرت ہے سبحان اللہ ایسی صنعتیں ہیں حق تعالیٰ کی اب اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ (۴) کا مضمون پورا واقع ہوگیا اس کے بعد دوسرا وعدہ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اپنے وقت میں صادق ہوگیا موسیٰ علیہ السلام کی ساری باتیں عجیب وغریب ہی ہوئیں مجاہدہ وریاضت بھی عجیب ہوا کہ دریا میں ڈالے گئے دشمن کے ہاتھ میں دئے گئے مگر کوئی ضرر نہیں ہوا۔

(۱) لَہٗ۔ ہاء کی ضمیر کو بادشاہ کی طرف راجع کرکے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا، فرعون دھوکہ کھا گیا (۲) دوسرے (۳) خوشی (۴) ہم اس کو تمہاری طرف لوٹادیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عجیب واقعات

نبوت بھی عجیب طرز سے ملی سردی کا زمانہ تھا مدین سے مصر کو اپنے گھر میں (۱) کو ساتھ لیکر آرہے تھے کہ راستہ میں اُن کو دردِ زِہ (۲) شروع ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام آگ لینے کو چلے تاکہ حالت دردزہ میں حرارت (۳) سے آرام ملے مگر وہ تو نورِ حق تھا وہاں جاکر نبوت عطا ہوئی ہادی خلق بنے۔ (۴) اسی طرح سے موت بھی عجیب وغریب طور سے آئی جس کا ابھی بیان کرتا ہوں۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی آپ کے نئے نئے قصے اور معاملات ظہور میں آئے۔ وہ موت کا واقعہ یہ ہوا کہ عزرائیل علیہ السلام آپ کے پاس قبض روح (۵) کے واسطے آئے آپ نے اُن کے ایک طمانچہ مارا (۶) بعض ملاحدہ نے اس قصہ سے انکار کیا ہے اصل یہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کے مراتب سے واقف نہیں ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے طمانچہ سے عزرائیل علیہ السلام کی آنکھ پھوٹ گئی تو عزرائیلؑ حق تعالیٰ کی حضور میں پہنچے اور عرض کیا انہ لا یرید الموت کہ موسیٰ علیہ السلام تو موت سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے اس طرح مارا۔ یہاں پر اشکال یہ ہے کہ کیا موسیٰؑ کو خدا کے حکم سے انکار تھا۔ جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پہچانا نہیں کیونکہ اس وقت عزرائیل علیہ السلام بہ شکل بشر آئے تھے (۷)۔ انبیاء علیہم السلام کا ادب یہی ہے کہ فرشتے ان کے پاس اپنی قاہرانہ (۸) صورت میں نہ آویں بلکہ کسی بشر کی (۹) صورت میں آویں اس لئے عزرائیل علیہ السلام بشر کی صورت میں آئے تھے موسیٰ علیہ السلام نے پہچانا نہیں اور ایک طمانچہ رسید کیا اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ فرشتوں میں تو بڑی قوت اور طاقت ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام کے طمانچہ سے ان کی آنکھ کیسے پھوٹ گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام میں قوت زیادہ تھی اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم ہے (۱۰) کہ فرشتوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اصل اور غالب یہ ہے کہ جس نوع (۱۱) کی صورت میں وہ آتے ہیں اس

(۱) اہلیہ کو (۲) بچہ پیدا ہونے کا درد (۳) پیدائش کے درد میں آگ کی گرمی سے آرام حاصل کریں (۴) مخلوق کے رہنما (۵) روح نکالنے (۶) تھپڑ مارا (۷) انسانی شکل وصورت میں (۸) ہیبت ناک شکل میں (۹) انسانی شکل (۱۰) یہ بات تسلیم شدہ ہے (۱۱) قسم۔

وقت اسی نوع کے برابر قوت ہوتی ہے جب فرشتہ شکل بشر میں ہوگا تو اس وقت اس میں بشر سے زیادہ قوت نہ ہوگی۔

جنات کی قوت وشکل وصورت

اسی طرح جنات بھی جس شکل میں ہوں گے اُسی جیسی قوت ہوگی ہمارے یہاں کا واقعہ ہے کہ ایک شخص مشرف خاں تھے وہ رات کو اپنے گھر میں دیر سے آتے تھے ہمارے دیوان خانہ کا قصہ ہے کہ ایک رات اس کے نیچے سڑک پر بہت دھما دھمی کی آواز ہوئی اور اس میں مشرف خاں نظر آئے صبح کو لوگوں نے مشرف خاں سے دریافت کیا کہ میاں رات کیسی آواز تھی انہوں نے بیان کیا کہ میاں رات کو میں دیر سے آیا کرتا تھا دو ایک روز ہوئے مجھے ایک جن ملا اُس نے مجھ سے کہا کہ سویرے آجایا کرو رات کو دیر کر کے آنے میں ہمیں تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اس وقت ہم باہر نکلتے ہیں میں نے کہنا نہیں مانا رات وہ پھر مل گیا اُس نے مجھے جانے نہ دیا۔ میری اور اس کی خوب کشتی ہوئی میں نے اسے پچھاڑ لیا غرض جن بھی جس کی شکل میں ہوگا اُسی جیسی طاقت ہوتی ہے مثلاً سانپ کی شکل میں ہو تو سانپ سی طاقت ہوگی اور کتے کی شکل میں ہو تو کتے کے سی طاقت ہوگی۔ کتے پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ہم اور ہمارے ایک رفیق سفر سرائے میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک کتا سامنے سے آگیا تو وہ رفیق صاحب اُسے جھک کر سلام کرنے لگے میں نے کہا کہ کیا واہیات حرکت تھی کہنے لگا کہ ہم نے سنا ہے کہ جن اکثر کتے کی شکل میں آتا ہے تو شاید یہ جن ہو اور جنوں کا بادشاہ ہو اور ہمیں خوش ہو کر روپیہ دے جاوے حالانکہ اہل فن کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ بادشاہ کتے کی شکل میں نہیں آتا اس قسم کی شکلوں میں غریب جن ہوتے ہیں اس لئے یہ امید بھی غلط نکلی بادشاہ تو پاکیزہ جانوروں کی شکلوں میں ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات وتدفین

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عزرائیلؑ کو بشر کی صورت میں دیکھ کر طمانچہ مارا

اور پہچانا نہیں دوبارہ پھر عزرائیل علیہ السلام بھیجے گئے اور آ کر انہوں نے حق تعالیٰ کا پیام پہنچایا اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو کسی بیل کی پشت پر ہاتھ رکھدو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آجائیں گے اتنے ہی سال کا عمر میں اضافہ ہوجائیگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا پھر کیا ہوگا جواب ملا کہ پھر موت آوے گی فرمایا تو پھر میں ابھی چلتا ہوں اب موسیٰ علیہ السلام راضی ہوگئے غرض وفات بھی عجیب وغریب طریقہ سے ہوئی۔ اور وادی تیہ میں وفات ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کی تمنا یہ تھی کہ بیت المقدس میں مدفون ہوں جہاں پر اور انبیاء کی قبریں ہیں تو خدا کے حکم سے زمین کی طنابیں (۱) کھنچ گئیں اور نعش بیت المقدس میں پہنچ گئی۔ غرض موسیٰ علیہ السلام کے قصے سب ہی عجیب وغریب ہیں اسی غرابت کیوجہ سے اُن کے واقعات قرآن پاک میں جا بجا مذکور ہیں تفسیر بیان القرآن لکھتے وقت اتفاقاً خیال ہوا کہ ان واقعات کو یکجا جمع کر کے ان کو مرتب کر دیا جاوے ورنہ تفسیر کے وقت ان واقعات کا مرتب سمجھنا دشوار ہوگا اور تفسیر میں دشواری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے مجھے قرآن پاک حفظ ہے اس لئے ایک جگہ اُن سب آیات کا جمع ہونا سہل ہوگیا پس آیات کو ایک جگہ جمع کر کے پھر اُن میں غور کر کے ترتیب دیدی تا کہ قرآن کی تفسیر میں سہولت رہے پھر جی میں آیا کہ ان آیات کا ترجمہ کر کے اسکا ایک مجموعہ تیار کیا جاوے تا کہ بجائے ناولوں کے اس کا دیکھنا مفید ہو اور تفسیر میں چونکہ یہ مضامین مختلف جگہ ہیں اس لئے متفرق مقامات سے ان کو مرتب کرنا عوام پر سخت دشوار ہوتا لہٰذا یہ مجموعہ مستقل مرتب کر کے شائع کر دیا گیا مگر وہ محض تفسیر سے تیار کیا گیا ہے۔ سِیَر کی روایات اس میں بالکل نہیں ہیں اور اس مجموعہ کے ساتھ ایک اور قصہ ابراہیم علیہ السلام کا بھی اضافہ کیا گیا کہ وہ بھی بعض وجوہ سے عجیب وغریب اور قرآن مجید میں کثیر الدور (۲) قصہ تھا اور اس سارے مجموعہ کا نام الترتیب اللطیف فی قصة الکلیم والحنیف رکھا گیا۔ یہ اطلاع تفریح کے لیے کر دی گئی یہاں تک تو آیت کا ترجمہ مقصود تھا۔

(۱) زمین سکڑ گئی (۲) قرآن پاک میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

صبر کی تلقین

اب صبر کا مضمون جو پہلی بار کے بیان میں زیادہ مقصود تھا وہ ان دو جملوں سے یعنی لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِی (۱) سے مستنبط ہوتا ہے یعنی والدہ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ: ﴿فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِی﴾ یعنی جب تم کو یہ اندیشہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام دشمن کے ہاتھ آجاویں گے اور وہ ان کو قتل کر دیگا تو ایسے وقت میں ان کو دریا میں ڈالدینا اور نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا یعنی ضبط کرنا اور صبر سے کام لینا۔ ایسے موقع پر دو چیزوں کا احتمال ہوسکتا تھا یعنی خوف کا اور حزن (۲) کا حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں دونوں احتمالوں کو دفع فرمادیا اور خوف وحزن میں فرق یہ ہے کہ خوف کہتے ہیں کسی آنے والے مضر واقعہ (۳) کا احتمال ہو اور حزن کہتے ہیں کہ کسی گذشتہ ناملائم (۴) واقعہ پر ناگواری اور افسوس ہو۔ یہاں واقعہ گذشتہ تو یہ تھا کہ ہائے میں نے بچہ کو اپنے ہاتھوں دریا میں ڈالدیا اس کو یاد کرکے حزن ہوسکتا تھا اور واقعہ آئندہ کا خوف یہ تھا کہ دیکھئے کس کے ہاتھ آوے اور وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے غرض یہاں دو چیزوں کا احتمال تھا حق تعالیٰ نے دونوں کے متعلق فرمایا کہ تم نہ تو دریا میں ڈال کر اپنے فعل پر پچھتانا اور نہ ڈالنے کے بعد آئندہ کا اندیشہ کرنا دونوں باتوں سے دور رہنا اور ایسے وقت ضبط اور صبر سے کام لینا۔

صاحبو! اس موقع پر صبر کرنا صبر علی الموت سے بھی اشد ہے (۵) کیونکہ موت تو ایسا واقعہ ہے جہاں صرف حزن (۶) ہی ہوتا ہے اور خوف نہیں ہوتا اور یہاں پر دونوں جمع ہیں خوف بھی حزن بھی غرض اکثر واقعات یا موجب حزن ہوتے ہیں یا موجب خوف اور یہ واقعہ خوف اور حزن دونوں کو متضمن ہے (۷) اس لئے ایسے واقعہ پر صبر سخت مشکل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایسا واقعہ شدیدہ پیش آنا اور پھر عورت ہوکر اس قدر صبر کرنا تعجب خیز امر ہے ایسے وقت میں مردوں کے بھی قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور صبر کرنا

(۱) تم خوف وغم میں مبتلا نہ ہو۔ القصص:۷ (۲) غم (۳) نقصان دہ (۴) طبیعت کے خلاف پیش آنے والے واقعہ پر (۵) موت پر صبر کرنے سے بھی مشکل ہے (۶) غم (۷) اس واقعہ میں خوف وغم دونوں باتیں تھیں۔

دشوار ہوجاتا ہے اور چونکہ جب یہ دونوں امر مجتمع(۱) ہوں یعنی خوف بھی ہو حزن بھی ہو پھر عورت کا جگر، اسکا تحمل کرنا اور اصلا دوسری طرف جنبش (۲) نہ کرنا عجیب بات تھی اس لئے حق تعالیٰ نے تسلی کے لیے اس موقع کے مناسب نہایت حکیمانہ مضمون ارشاد فرمایا کہ ہر ہر پہلو سے پوری تسلی فرمادی۔ آدمی کے طبائع اور جذبات اولاد کے متعلق مختلف ہوتے ہیں یہاں سب کی پوری رعایت ہے۔ اس لئے صبر کی تعلیم کے لیے واللہ یہ مضمون کافی ہے۔ کوئی عقلمند آدمی بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس قسم کی حکیمانہ تسلی سن کر رنجیدہ رہے (۳) بلکہ یہ سن کر کہ بچہ سے پھر ملنا ہوگا، قلب سے ملال بالکل رفع ہوکر کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ جاوے گی۔

تسلی کا خوبصورت انداز

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قلب میں جو وساوس پیدا ہوتے ہیں سب کو علماً وعملاً دونوں طرح رفع (۴) فرما کر مضمون کو کامل کردیا چنانچہ اول اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْن سے عقلی لِمْ (۵) بیان فرمائی کہ تم غمگین نہ ہونا کیونکہ ہم ان کو تمہارے پاس واپس لاویں گے یعنی موسیٰ علیہ السلام اس وقت دریا میں بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث غم ہو اور آئندہ بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث خوف ہو بلکہ ان کی عمر اتنی دراز کریں گے کہ چالیس سال کے بعد ان کو رسولوں میں سے بناویں گے۔ غرض مصیبت کے وقت یہی دو باتیں پیش آتی ہیں خوف اور حزن یہی دو امر اکثر واقع ہوتے ہیں مثلاً بیٹے کا مرجانا اس وقت ایک تو اپنے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہم سے جدا ہوگیا اور ایک اس کے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے وہ ہمارے پاس کھاتا پیتا تھا اب ان باتوں سے روکدیا گیا اب کی مرتبہ آم سے محروم رہا اور آئندہ کے لیے اپنے اعتبار سے اندیشہ ہوتا ہے کہ دیکھئے اس کی مفارقت (۶) میں ہمارا کیا حشر ہو تو حق تعالیٰ حزن وخوف دونوں کو اس جگہ رفع فرماتے ہیں کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو تمہارے پاس واپس لاویں گے اور ان کو پیغمبر بناویں گے تو آئندہ ہلاک بھی نہ ہونے دیں گے عمر دراز ہوگی اس سے خوف کو رفع فرمادیا نیز تم سے پھر ملیں گے لہٰذا یہ بھی غم نہ کرنا کہ میری آنکھوں سے غائب ہوگئے غرض

(۱) دونوں باتیں جمع ہوجائیں (۲) دوسری طرف نہ جھکنا (۳) غم زدہ (۴) علمی اور عملی طور سے دور کردیا (۵) وجہ (۶) جدائی۔

آیت لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِی سے دونوں قسم کے واقعوں پر ضبط نفس کی تعلیم معلوم ہوگئی جس کا نام صبر ہے۔ قواعد شرعیہ کس قدر جامع مانع ہیں کہ دونوں قسم کے اثر کا ازالہ فرمادیا۔

بدوی کی ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نصیحت

اسی قسم کے مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ یعنی حضور کے چچا کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بیان کیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کا جو کچھ غم تھا اس پر کسی کے قول سے اتنی تسلی نہیں ہوئی جتنی ایک گنوار آدمی کے قول سے مجھے تسلی ہوئی وہ مضمون تسلی بخش یہ تھا ؎

اصبر نکن بك صابرین فانما صبر الرعیة بعد صبر الراس

یعنی آپ صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہوتا ہے آپ بڑے ہیں پہلے آپ صبر کیجئے ؎

خیر من العباس اجرك بعده واللّٰه خیر منك للعباس

یعنی اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور ثواب تمہارے لیے حضرت عباس سے بہتر ہے اور نہ حضرت عباس کا کچھ نقصان ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباس کے لیے تم سے بہتر ہیں یعنی تمہارے پاس رہنے سے اُن کا اللہ کے پاس رہنا زیادہ بہتر ہے تو کسی کا بھی نقصان اور گھاٹا نہ ہوا دونوں نفع میں رہے پھر غم کیسا عجیب مضمون بیان کیا ایک اعرابی (بدوی) ایسا مضمون بیان کرے تعجب خیز امر ہے نہ علم نہ صحبت پھر ایسا مضمون؟

بدووں کے احوال

بدووں کی کی تو اکثر یہ حالت تھی کہ علم اُن کے پاس کو نہیں گذرا تھا چنانچہ نماز میں ایک بدوی شریک ہوا امام نے یہ آیت پڑھی: ﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (۱) جسمیں بعض بدووں کی

(۱) ''دیہاتی لوگ کفر ونفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور انکو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اُن کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں''۔ التوبۃ: ۹۷۔

مذمت تھی آپ بہت خفا ہوئے اور بگڑے جب دوسری آیت پڑھی ﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾(۱) جس میں بعض بدووں کی تعریف تھی جب ذرا خوش ہوئے کہ خیر تعریف بھی کردی اسی طرح ایک بدوی نے چوری کی اور چوری کرکے روپیہ داہنے ہاتھ میں لیکر نماز کی نیت ایک امام کے پیچھے باندھ لی اتفاق سے اس کا نام موسیٰ تھا اور جہری نماز تھی، امام نے پڑھا ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى﴾ یعنی اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے تو آپ فوراً کہتے ہیں قاتلك الله ما سحرك تجھے خدا غارت کرے تو کتنا بڑا جادوگر ہے۔ بدوی تو اب بھی اکثر ایسے جاہل اور ناواقف ہوتے ہیں کہ پانی موجود اور تیمّم کرکے نماز پڑھ لی۔ امام کے آگے کھڑے ہوگئے اور اقتدا کرلیا، یہ حالت ہے بدووں کی۔ ایک مولوی صاحب مکی بیان کرتے تھے کہ ایک بدوی حراج (منڈی) میں اپنے کام کو بکثرت مکہ آیا کرتا تھا ایک دفعہ وہ سوال کرتا ہے کہ لوگ چہار طرف سے مکہ میں کیوں آتے ہیں مکہ میں کیا بات ہے اس کو یہ خبر نہ تھی کہ یہاں بیت اللہ کوئی چیز ہے مگر باوجود ان امور کے اور اس قدر جہالت کے انکا دل بے حد صاف ہے کچھ غل وغش نہیں چنانچہ وہی مولوی صاحب مدینہ طیبہ کی حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک بدوی مدینہ طیبہ میں آیا اور روضہ اقدس پر آکر کھڑا ہوکر کہتا ہے یا محمد یا محمد میں نے سنا ہے کہ آپ کو امت پر بہت شفقت کی نظر ہے اور آپ پیغمبر ہیں اگر یہ بات سچی ہے تو میرے گاؤں میں بارش نہیں ہوتی اور قحط ہورہا ہے دعا کیجئے اگر میرے گاؤں میں بارش ہوجائے تو میں ایک مشکیزہ گھی کا آپ کو دوں گا خادموں نے اس کی یہ گستاخانہ گفتگو سن کر اس کو ڈانٹا وہ وہاں سے باہر کو بھاگا۔ تو گاؤں کی سمت کو گیا کیا دیکھتا ہے کہ بادل گھرا ہوا ہے بارش ہورہی ہے فوراً ایک مشکیزہ گھی کا خریدا اور پھر روضہ شریف پر یہ کہتا ہوا حاضر ہوا کہ آپ بالکل سچے ہیں اور وہ مشکیزہ گھی سے بھرا ہوا لیکر روضہ مبارک پر کھڑا ہوگیا اور موقع دیکھتا رہا جب خادموں کی نظر بچی فوراً مشکیزہ کا دھانہ کھول کر جالی شریف میں ڈالا اور نکل کر بھاگ گیا اس وقت اتفاق سے ایک سالک فقیر بھی مسجد نبوی میں

(۱) ''اور بعضے دیہاتی ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں'' التوبۃ:۹۹

موجود تھا جو ایک مدت سے مزار پر پڑا ہوا تھا اور اس کا کوئی باطنی مقام اٹکا ہوا تھا جو حل نہ ہوتا تھا وہ اس بدوی کی گفتگو سن رہا تھا اور حضور کی برکت سے بارش کا واقعہ دیکھ رہا تھا یہ قصہ دیکھ کر خفا ہو گیا اور گستاخانہ بکنے لگا کہ آپ کو بھی حمیت قومی کا خیال ہوا آخر تو یہ بدوی عرب تھا اس لئے اس کی درخواست پر کیسی توجہ کی اور ہم اتنے دنوں سے محروم ہیں نعوذ باللہ غرض وہ بدوی گو جاہل تھا مگر تھا تو مخلص۔ اور ایک بدوی یہ تھے کہ ابن عباسؓ کو نصیحت کی تھی اور تسلی دی تھی جو اس آیت سے ماخوذ تھی ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَاللّٰهِ بَاقٍ﴾ (۱) کہ تمہارے پاس جس قدر چیزیں ہیں فنا ہونے والی ہیں اور خدا تعالیٰ کے پاس جس قدر چیزیں ہیں باقی رہنے والی ہیں اور ایک ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں کہ ہم کو یہ باتیں سوچ کر بھی تسلی نہیں ہوتی۔

مومن ہمیشہ راحت میں ہے

غرض اعزہ واقرباء کی موت سے ہمیں اجر ملے گا اور مردہ کو خدا کا قرب میسر ہوگا اور دونوں کا انحصار تسلی بخش یہ چیز ہے۔ اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ مردہ کو قرب خدا کا ملنا جب ہے کہ یہ یقیناً معلوم ہو کہ مردہ مرحوم ومغفور ہوا اور جب یہ معلوم نہیں تو عذاب کا بھی احتمال ہے اُس صورت میں تو دنیا ہی میں رہنا بہتر ہے پھر اس استحضار کی گنجائش کہاں رہی تو جواب یہ ہے کہ یہاں ذکر مؤمنین کا ہے اور مؤمن اگر فاسق بھی ہو تو آخرت اس کے واسطے دنیا سے ہر حال میں اچھی ہے اس لئے کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہوں ایک تو باغ میں اور عیش میں ہو اور دوسرا تکلیف اور زحمت میں ہو مگر جو عیش میں ہے وہ دو گھنٹہ کے بعد تکلیف میں پڑنے والا ہے اور اس کو معلوم بھی کرا دیا ہے مثلاً پھانسی پر چڑھنے والا ہے اور تکلیف اس کے واسطے ہمیشہ کے لیے مقدر اور مقرر ہے تو اس وقت کا عیش بھی اس کے لیے عیش نہیں بلکہ اس سوچ اور اندیشہ کی وجہ سے کہ گھنٹہ کے بعد کیا ہوگا اس عیش کی راحت اور چین اُسے معلوم بھی نہیں ہوگی کہ اس میں کیا راحت اور چین ہے اور جو شخص تکلیف میں ہے مگر دو گھنٹہ کے بعد آرام میں جانے والا

(۱) النحل: ۹۶۔

ہے اور اس کو بھی معلوم کرادیا گیا ہے اسے وہ تکلیف نہیں معلوم ہوگی بلکہ بعد کی راحت کی خوشی میں وہ تکلیف کو کچھ بھی نہ سمجھے گا غرض جس عیش کے فوت کا اندیشہ ہو وہ عیش عیش نہیں اور ایسے ہی جس مصیبت کے ختم ہونے کی امید ہو وہ مصیبت مصیبت نہیں۔ پس ایمان کے ساتھ اگر مؤمنین دوزخ میں بھی ہوں تب بھی وہ مصیبت مصیبت نہیں کیونکہ وہ ختم ہونے والی ہے اس لئے اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ تکلیف میں ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ راحت میں ہے وجہ یہ مومن دوزخی واقع میں دوزخی نہیں بلکہ وہ جنتی ہے اور اس وقت زبان حال سے وہ یہ کہہ رہا ہے ۔

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم کہ شاید دست من باردگر جاناں من گیرد(۱)

اس کو یہ امید ہر وقت رہے گی کہ اب بھی ہاتھ پکڑ لیں گے اب دوزخ سے نکال لیں گے برخلاف کافر کے وہ ابدالآباد کے لیے جہنمی ہوگا اور کوئی اس قسم کا دقیقہ بھی باقی نہ رکھا جاویگا جس کی وجہ سے وہ امید کر سکے۔

شبہ کا ازالہ

اور اس گفتگو پر کسی قسم کا شک وشبہ نہ کیا جاوے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مؤمن دوزخی بھی اچھے حال میں ہوگا اور نیز یہ شبہ بھی نہ کیا جاوے کہ اس قسم کے مضامین سے ناز اور بھروسہ ہوکر آدمی دلیر ہوجاویں گے لہٰذا اس قسم کے مضامین کا اظہار بیان میں بھی مناسب نہیں جواب یہ ہے کہ جب حضور نے ان باتوں کو خود بیان فرمادیا ہے تو ہمیں کوئی منصب اخفا کا نہیں (۲)۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے جس کو مسلم نے روایت کیا ہے کہ اہل ایمان کو دوزخ میں ایک قسم کی موت آجاوے گی یعنی نیند کی سی کیفیت طاری ہوگی جس سے ادراک الم (۳) کا کافر کے برابر نہ ہوگا اور حضرت حق جل وعلاشانہ کافروں کے حق میں فرماتے ہیں لا یزکیھم (۴) اور وعید میں مفہوم مخالف (۵) معتبر

(۱) ''اگرچہ اس وقت میں محبوب سے دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب (اللہ تعالیٰ) دوبارہ میرا ہاتھ تھام لیں گے (۲) ہمیں اس کو چھپانے کا حق نہیں (۳) درد کا احساس (۴) ان کو پاک صاف نہیں کریں گے (۵) یعنی مسلمانوں کو پاک صاف کردیں گے۔

ہوتا ہے تو اس سے صاف لازم آ گیا کہ مؤمنین کا تزکیہ کیا جاویگا پس تعذیب (۱) ان کے حق میں تہذیب ہوگی اور دوزخ ان کے لیے بمنزلہ حمام (۲) کے ہوگا جیسا کوئی آدمی کسی حاکم سے ملنے کو جاتا ہے تو سفر کا جو کچھ میل کچیل ہوتا ہے اُس سے پاک صاف ہوکر نہا دھوکر غسل کر کے اس کو جانا چاہئے اگر کوئی ایسا نہ کرے اور شاہی انتظام سے اس کو حمام کرادیا جاوے تو وہ عنایت ہے کہ اس کو حاضری دربار کے لائق بنادیا گیا اسی طرح مؤمنین میں جو کچھ میل کچیل ہوگا جو مانع ہے (۳) دخول جنت اور لقاء رب (۴) سے اس کو حق تعالیٰ دوزخ میں داخل فرما کر صاف فرمادیں گے گو یہ شخص اپنے لیے اس کو تجویز نہ کرے پس یہ حالت اس کی ایسی ہوگی ۔

طفل مے لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام (۵)

مومن کے لیے دوزخ کی مثال

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک راجہ کے لڑکی تھی وہ چاہتا تھا کہ کسی سے اس کا عقد کرے مگر کسی کو اپنا کفو (۶) نہ سمجھتا تھا اتفاق سے ہوا کے بگولہ میں ایک چمار (۷) کا لڑکا اڑ کر اس کی چھت پر آپڑا انہوں نے سمجھا کہ یہ غیبی لڑکا ہے جو کہ عقد کے لیے بھیجا گیا ہے اور واقع میں تھا وہ غیبی ان لوگوں نے اس کا سامان شروع کیا اور حمام میں نہلانے کو لے گئے گرم پانی سے نہلانا چاہا وہ بہت چلایا بہت کچھ بہلایا کسی طرح بہلتا ہی نہیں تھا جواہرات سامنے لائے گئے تو آنکھیں بند کرلیں پھر اس کو عمدہ کپڑے پہنائے گئے اور زیادہ چلانا پھر لڑکی کو زیورات وغیرہ پہنا کر سامنے لایا گیا تا کہ اس کے حسن و جمال سے مانوس ہو تب تو بہت ہی پریشان ہوا آخر یہ رائے ہوئی یہ غیبی مخلوق ہے ناسوت (۸) سے مانوس نہیں چند روز کے لیے اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے آخر ایسا ہی کیا گیا مگر اس کی کسی طرح کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اتفاق سے اسکا دروازہ کی طرف جانا

(۱) مسلمانوں کے لیے دوزخ کا عذاب ان کی درستگی کے لیے ہے (۲) غسل خانہ (۳) رکاوٹ ہے (۴) رب سے ملاقات میں (۵) بچہ تو نشتر لگانے والے سے خوف زدہ ہے لیکن اس کی ماں خوش ہے کہ اس نشتر فاسد مادہ نکل کر بچہ صحت یاب ہوجائے گا (۶) اپنی برابری (۷) بھنگی جمعدار (۸) دنیا سے مانوس نہیں۔

ہوگیا نکل کر بھاگا گھر پہنچ کر ماں سے ملکر بہت رویا کہ اے اماں تجھے خبر بھی ہے کہ میرے ساتھ کیا کیا سلوک ہوا میرے اوپر تپتا پانی ڈالا کہ میں مرجاؤں جب بھی میں نہ مرا میّا(۱) پھر میرے سامنے کفن لایا گیا جب بھی میں نہ مرا میا پھر جلتی جلتی آگ سامنے لائے جب بھی میں نہ مرا میّا پھر ایک ڈائن کو میرے سامنے لائے کہ وہ مجھ کو کھا جائے جب بھی میں نہ مرا میّا۔ تو جیسے یہ لڑکا حمام کو بلا سمجھا ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ہم بھی دوزخ کے حمام سے گھبراتے ہیں صاحبو! دنیا کی مثال بھی حمام کی ہی ہے جس میں مؤمن کو مجاہدات وریاضت سے صاف ہونے کا حکم ہے تو جو شخص یہاں کے حمام میں طاعات اور بلیات پر صبر کرکے اپنے کو پاک صاف کرکے نہ گیا وہ دوزخ کے حمام میں ڈال کر پاک صاف کیا جائیگا تا کہ لقاء خداوندی کے (۲) قابل ہو کفار سے اسی کو منفی فرمانے کے لیے ارشاد فرمایا ہے وَلَا يُزَكِّيهِمْ یہ کفار کے حق میں ہے کہ حق تعالیٰ کفار کو پاک صاف نہ کریں گے اس سے مفہوم ہوا کہ مسلمانوں کو پاک صاف کرینگے اور ان کو دوزخ میں پاک صاف کرنے ہی لیجاویں گے۔ پس دوزخ حمام اعظم ہے بقدر میل کچیل کے وہاں رہنا ہوگا۔ دوزخ میں لیجا کر میل کچیل اُتاریں گے غسل دیں گے مگر چونکہ آخر آگ ہے اس لئے مؤمنین کو بھی (باوجودیکہ مقصود وہاں رہنا نہ ہوگا صرف صفائی کے لیے جانا ہوگا) اس حمام کی تکلیف کا تحمل نہ ہوسکے گا اُس تکلیف کو برداشت نہ کرسکیں گے اس لئے یہ مضمون سن کر کسی کو جرأت کی گنجائش نہیں لیکن ہر حال میں مؤمن کا دوزخ میں رہنا عذاب کے ساتھ بھی یہاں کے عیش وآرام سے اچھا ہے اب وہ شبہ جاتا رہا کہ آخرت میں جانا اُسی کے واسطے بہتر ہے جسے دوزخ میں جانے کا خوف نہ ہو کیونکہ اوپر ثابت کردیا گیا کہ مؤمن ہر حال میں یہاں کی حالت سے وہاں آرام ہی میں ہوں گے کیونکہ وہ ایک دن جنت میں واپس ہونے والے ہیں اور ان کو معلوم بھی کرادیا جاویگا پس جس مفارقت کے بعد وصال کی اُمید ہو وہ بحکم وصال ہی ہے۔

(۱) پھر بھی اے ماں میں نہیں مرا (۲) خدا سے ملنے کے قابل ہو۔

وجہ تسلی

اور اس مضمون کو اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ (۱) سے بھی بطریق قیاس صحیح ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں بھی واپسی ہی سے تسلی کی گئی تھی کہ ہم موسیٰ کو پھر تمہارے پاس لوٹا دیں گے تا کہ تم پھر مل لو اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا کر اطمینان قلبی حاصل کرلو اس وجہ سے حزن (۲) نہ کرو یہی علت دونوں جگہ مشترک ہے اور یہی تسلی کی وجہ واقعہ غم میں ہمارے لیے بھی ہوسکتی ہے کہ مردہ گو ہمارے پاس دنیا میں واپس نہ ہوگا لیکن جب ہم جاویں گے اور اُس سے ملیں گے تو یہ بھی واپسی ہی کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود جو کہ ملاقات ہے وہ اس صورت میں بھی بدرجہ اتم حاصل ہے کیونکہ اس ملاقات کے بعد پھر مفارقت (۳) کا اندیشہ ہی نہیں اس لیے ہمیں بھی حزن زیبا نہیں کیونکہ سب کا اجتماع خدا کے یہاں ہوگا چنانچہ حق تعالیٰ اسی کو دوسرے الفاظ میں فرماتے ہیں اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن کہ ہم سب یعنی مردہ اور اُس کے سب متعلقین ان ہی کے پاس جانے والے ہیں وہاں سب مل لیں گے اسی لیے کسی عزیز کی موت کے وقت ہمیں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے مضمون کو سوچا کریں خدا تعالیٰ کے یہاں سب کا اجتماع ہوگا اور سب آپس میں ہمیشہ کے لیے ملتے جلتے رہیں گے۔

مرحومین کی آپس میں ملاقات

آخرت تو کسی قدر شاید دور سمجھی جاوے روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی سب مل جل لیتے ہیں چنانچہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب کوئی مر کر یہاں سے عالم ارواح میں پہنچتا ہے تو روحیں بہت خوش ہوتی ہیں جیسے کوئی عزیز سفر سے آتا ہے اور اُس سے مل کر ہم خوش ہوتے ہیں سب کی خیریت دریافت کرتی ہیں کہ ہمارا بھائی اچھا ہے، فلاں شخص اچھا ہے یہاں تک کہ ایک شخص کو دریافت کرتی ہیں کہ وہ اچھا ہے یہ مردہ جواب دیتا ہے کہ وہ تو مر گیا تو وہ کہتی ہیں کہ وہ شاید دوزخ میں گیا ہوگا وہ یہاں نہیں آیا پھر کہتی ہیں کہ بھائی تھکا ماندہ آیا ہے اسے آرام لینے دو پھر پوچھ

(۱) ہم اس کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے (۲) غم نہ کرو (۳) جدائی۔

پاچھ لینا پس جب مردہ سے ایک دن ہم کو ملنا نصیب ہوگا تو یہ مفارقت محض عارضی ہے(۱) اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص حیدرآباد جا کر ملازم ہوجاوے تو اس کی جدائی پر جبکہ وہ حیدرآباد میں یہاں سے زیادہ آرام میں ہو کون اس قدر روتا اور رنج کرتا ہے بلکہ تمنائیں کرتے ہیں کہ وہ حیدرآباد ہی میں ملازم رہے باقی ہم کسی نہ کسی دن مل بھی لیں گے۔

عارفین کی شان

اس استحضار میں عارفین کی یہی شان ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص روتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے کہ تندرست ہوجاوے حضرت نے فرمایا کہ افسوس ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹتا ہے اور دوسرا روتا ہے۔ اور فرمایا کہ تم بھی اسی طرح چھوٹ جاؤ گے پھر وہ بولا کہ حضرت میری روٹی کون پکاویگا۔ ارشاد فرمایا کہ ہاں بھائی جب تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی تمہارے ساتھ روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی حضرت نے یہ باتیں اس طرح فرمائیں کہ جیسے یہ مشاہدہ واستحضار(۲) حضرت کا حال ہو پھر وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت ایک شخص مجھے مدینہ طیبہ ہمراہ لے چلنے کو کہتا تھا اب انکار کرتا ہے دعا کیجئے کہ وہ مدینہ طیبہ لے چلے حضرت خفا ہوگئے کہ ہم سے ایسی شرک کی باتیں نہ کرو ظاہر بینوں کے نزدیک تو یہ بات بگڑنے کی نہ تھی مگر جس نے سوئی دیکھی ہو کہ پتلی پتلی چمکتی چمکتی ہے مگر اس کی نوک نہ دیکھی ہو اسے کیا خبر، وہ تو سُوئی کو یہ سمجھے گا کہ یہ خوبصورت تنکا ہے مگر جس کو سوئی کی نوک کا بھی احساس اور ادراک ہو وہ واقعی اُسے معمولی چیز نہ سمجھے گا اس لئے اس واقعہ میں ہمارے نزدیک بگڑنے کی کچھ بھی بات نہیں۔ مگر عارفین کو جن باتوں سے شرک کی بو آتی ہے جیسے اس میں غیر اللہ پر نظر ہونے کا حضرت کو احساس ہوا وہ تو ان کو نشتر سے بھی زیادہ ایذاء دہ(۳) سمجھیں گے گو دوسروں کو احساس نہ ہو۔

(۱) یہ جدائی صرف عارضی ہے (۲) گویا حضرت کے سامنے یہ باتیں ہیں اور آپ انہیں دیکھ رہے ہیں (۳) چھری سے کاٹے جانے سے بھی زیادہ تکلیف دہ سمجھیں گے۔

اللہ کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں

ایک ایسا ہی اور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ بارش ہونے پر ایک بزرگ کے منہ سے نکل گیا کہ بڑے موقع پر بارش ہوئی، اُسی وقت عتاب ہوا کہ او بدتمیز بے موقع بارش کب ہوئی تھی جو آج کی بارش کو موقع کی کہتا ہے، اور واقع میں وہ خلاف مصلحت کب کرتے ہیں اللہ میاں تو حکیم ہیں ان کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں ہوتا۔ دیکھئے ظاہر میں یہ بات معمولی تھی مگر سخت گرفت ہوئی اور صحیح گرفت ہوئی۔ اسی طرح عارفین بھی بعض دفعہ طالبین پر معمولی بات پر عتاب کرتے ہیں کیونکہ واقع میں وہ معمولی نہیں ہوتی خدا تعالیٰ کے یہاں بھی جو باتیں ہمارے نزدیک ذرا سی اور چھوٹی ہیں اور ہم ان کو خفیف سمجھتے ہیں بعض اوقات اُن پر پکڑ ہو جائیگی کیونکہ وہ واقع میں بڑی باتیں ہیں۔

احکام دین کو ہلکا سمجھنے کی سزا

ایک عالم شخص کا قصہ میں نے اپنے ابتدائی کتابوں کے استاد سے سنا ہے وہ بواسطہ شیخ دہان مکی کے نقل فرماتے تھے کہ انکا مکہ میں انتقال ہوا کسی ضرورت سے قبر کھولی گئی تو دیکھا کہ قبر میں اس کی صورت مسخ ہوگئی اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ یہ ایسا کیا عمل کرتا تھا معلوم ہوا کہ بیوی سے مشغولی کے وقت نہاتا ہوا گھبراتا تھا اور اس مسئلہ میں عیسوی مذہب کی مدح کرتا تھا کہ اُن کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی کی ظاہری نظر میں یہ ذرا سی بات ہو مگر فی الواقع ایسی ذرا سی بات ہے جیسے شیطان کی ذرا سی بات تھی کہ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا(۱) اور اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۲) مطلب یہ ہے کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا فرمایا اور آدم کو مٹی سے اور ظاہر ہے کہ آگ افضل (۳) ہے مٹی سے اور افضل کے سامنے مفضول کو سجدہ کرنا چاہئے نہ کہ افضل کو، دیکھئے بعض کے نزدیک تو یہ بھی ذرا ہی سی بات

(۱) ''کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا'' الاسراء:۶۱ (۲) ''میں آدم سے بہتر ہوں مجھے تو آپ نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے'' الاعراف:۱۲ (۳) کیونکہ آگ عنصر خفیف ہے اور مٹی عنصر ثقیل اور عنصر خفیف ثقیل کی طرف نہیں مائل ہوتا بلکہ ثقیل کا ہی ہمیشہ خفیف کی طرف میلان ہوتا ہے اور ثقیل ہمیشہ پست رہتا ہے خفیف سے۔

تھی جو شیطان نے کہی تھی کہ خدا کے حکم کو خلاف حکمت کہا تھا مگر واقع میں کتنی بڑی بات تھی اسی وجہ سے ابدالآباد کے لیے جہنمی ہوگیا یہ بیچ کا مضمون تو حضرت حاجی صاحب کے اس ارشاد کی مناسبت سے کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو واستطراداً آ گیا۔

حمام اعظم

اصل مضمون یہ تھا کہ حضرت نے اُس دعا کرانے والے سے فرمایا کہ ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا افسوس کر رہا ہے تو حقیقت میں دنیا جیل خانہ ہی ہے جس کے ختم ہوتے ہی باغ و بہار ہے۔ ہاں جو لوگ یہاں سے پاک صاف ہو کر نہیں گئے وہ کچھ دنوں کو حمام اعظم (دوزخ) میں جاویں گے کوئی ہزار برس کوئی دو ہزار برس مگر ہزار دو ہزار برس گو ظاہر نظر میں بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں مگر واقع اور حقیقت میں خلود جنت (۱) کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں بہت تھوڑی مدت ہے کیونکہ یہ زمانہ مومنین کے دوزخ میں رہنے کا محدود ہے اور جنت کا قیام غیر محدود ہے پس کوئی مسلمان شخص آخرت میں نقصان میں نہیں۔

موت پر غم کرنے کی حقیقت اور حکمت

اسی طرح اس کے مرنے کے بعد دنیا میں بھی کسی کا نقصان نہیں نہ مردہ کا کہ وہ یہاں سے اچھی جگہ چلا گیا نہ زندوں کا ان کو مردہ سے اچھی چیز مل گئی یعنی ثواب اور پھر چند روز میں خود وہ مردہ بھی مل جاویگا جیسا مفصل بیان ہوا اور یہاں جو لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ارشاد ہے اس کے متعلق ایک نہایت ضروری ومفید مضمون قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ لَا تَحْزَنِیْ کا یہ مقصود نہیں کہ مطلق غم نہ کرو کیونکہ وہ تو امر طبعی غیر اختیاری ہے اس کے ساتھ امر و نہی متعلق نہیں ہوسکتا (۲) بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے غم نہ کرو باقی جس قدر خود ہو، اسے ہونے دو یہاں دو سوال وجواب ضروری ہیں دوسرے سوال کے جواب میں اس کی

(۱) جنت میں ہمیشہ رہنے کے اعتبار سے (۲) اس کے کرنے نہ کرنے کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

توضیح ہوجاویگی کہ اختیار سے غم کرنے کی ممانعت ہے اضطراری سے ممانعت (۱) نہیں ایک سوال تو یہ ہے۔ اللہ میاں نے غم کو گو اضطراری (۲) ہی ہو پیدا ہی کیوں فرمایا جب مرنے کے بعد ہر شخص کو اپنے وطن پہنچنا ہے اور اسکا مقتضا یہ ہے کہ کسی چیز پر غم نہ ہو تو جس طرح یہ مقتضا عقلی ہے اسی طرح طبعی وتکوینی بھی رکھا جاتا اور اضطراری غم بھی پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ ایسے وقت بظاہر مناسب یہ تھا کہ حق تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے کہ غم ہی نہ ہونے دیتے۔ دوسرا سوال جو اسی پر متفرع (۳) ہے یہ ہے کہ جب اضطراراً غم (۴) پیدا کر دیا گیا تو پھر غم سے ممانعت ہمیں کیسی ہے اضطراری کا رفع اختیاری کیسے ہوسکتا ہے (۵) یہ دو سوال عجیب وغریب ہیں پہلے سے علم میں نہ تھے یعنی اصل اور عمود تو ذہن میں تھا مگر ان شاخوں کی طرف ذہن منتقل نہ ہوا تھا اسی وقت اس طرف ذہن منتقل ہوا اور ساتھ ساتھ جواب بھی القاء ہوگیا سنئے غم کے پیدا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ تمام عالم کا قیام غم پر ہے، آپ کو تعجب ہوگا کہ عالم کا قیام غم پر کیونکر ہے۔ ظاہراً تو خوشی پر معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مدار تکوین مخلوق انسان ہے یعنی عالم کے پیدا کرنے سے اصل مقصود انسان کی پیدائش ہے باقی مخلوقات اصل مقصود نہیں گو باقی مخلوقات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے مگر ان کا پہلے پیدا ہونا بھی اسی کی دلیل ہے کہ انسان مقصود ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص کہیں مہمان جاتا ہے تو میزبان سب سامان مہمانی کا پہلے جمع کر دیتا ہے حتی کہ ڈھیلے استنجے (۶) کے بھی مہمان کے آنے سے پہلے رکھ دئے جاتے ہیں تاکہ وہ تلاش نہ کرے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے گائے، بیل، مکان، زمین پانی وغیرہ غرض تمام ضروری سامان انسان سے پہلے جمع کر دیا تاکہ سکونت ارضی کے وقت اس کو دشواری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں پہلے سامان پیدا کیا اور آدم علیہ السلام بعد میں اُترے۔

(۱) غیر اختیاری غم کی ممانعت نہیں (۲) اگرچہ غیر اختیاری ہی ہو (۳) جو اسی سوال سے متعلق ہے (۴) بے اختیار (۵) جو چیز انسان کے اختیار میں نہ ہو اس کو کیسے دور کرے (۶) طہارت حاصل کرنے کے لیے مٹی کے ڈلے۔

شبہ کا جواب

یہاں پر ایک حکایت یاد آئی میری بھتیجی مجھ سے تفسیر پڑھا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر آدم علیہ السلام گیہوں نہ کھاتے تو زمین میں اُترتے یا نہ اُترتے اگر نہ اُترتے ،تو فی الارض خلیفہ کے کیا معنی اور اگر اترتے تو یہ گیہوں کھانے کا الزام کس بناء پر ہے۔میں نے یہ شق اختیار کی کہ ضرور اُترتے تاکہ خلافت کی تکمیل کی جاوے مگر اس صورت میں اکرام کے ساتھ اُترتے اب الزام کے ساتھ اوترے جیسے اسکول میں کوئی طالب بھیجا جائے اگر وہ قانون کے موافق چلا آیا تو عزت سے آیا اگر نافرمانی کر کے آیا تو گو آیا اس وقت بھی مگر عزت سے نہیں آیا وہ لڑکی یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئی۔ایک بچی کے دل میں یہ اشکال ہونا عجیب ہے جو اب تک کسی طالب علم سے بھی نہیں سنا گیا اگر کسی غیر طالب علم سے پڑھتی مثلاً مُلّا نی سے تو جواب میں دشواری ہوتی اور یہ شبہ ہمیشہ کے لیے کھٹکتا رہتا اب وہ چونکہ مجھ سے پڑھتی تھی اس لیے یہ شبہ رفع ہوگیا اگر جواب میری سمجھ میں نہ آتا تو میں اور کسی عالم سے دریافت کر کے اس کو بتلاتا۔

مقصود کائنات

بہرحال تمام مخلوقات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے جس کی ایک لطیف دلیل یہ آیت بھی ہے۔حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾(۱) یعنی اگر اللہ تعالیٰ آدمیوں سے اعمال پر مواخذہ فرماتے تو روئے زمین پر کسی دابہ کو نہ چھوڑتے۔اس قضیہ شرطیہ کے مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ انسان پر مواخذہ کا مقتضا ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین انسان کو نہ چھوڑا جاتا اب علاقہ ظاہر

(۱)الفاطر:۳۵/۴۵۔

ہوگیا کہ چونکہ مخلوق کی پیدائش سے مقصود بالذات انسان ہے پس جب انسان ہی نہ رہتا تو اور مخلوق کو باقی رکھ کر کیا کرتے وہ سب تو انسان ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے وہ سب بھی فنا کر دیجاتی پس علاقہ واضح ہوگیا اور اس سے مقصودیت مذکورہ پر دلالت ثابت ہوگئی۔

حکمت غم

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کی بقا کس شئے پر موقوف ہے، تو بالکل ظاہر ہے کہ تمام دارومدار تمدن پر ہے کہ سب آدمی جمع ہوکر ایک دوسرے کی مدد کریں کوئی گھر بنائے، کوئی کھیتی کرے وغیرہ وغیرہ اگر تمدن نہ ہوتو کام اتنے ہیں کہ ایک آدمی سے انصرام سخت دشوار ہے(۱)۔ غرض بقاء کا مدار اجتماع پر ہے اور اجتماع کا تعاون پر، اور تعاون کا ترحم پر، ترحم کے بغیر کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ یہاں پر عبدالرحیم طالب علم بیمار ہے اگر ترحم نہ ہوتا تو اس کی کون مدد کرتا۔ اب اہل قصبہ جو اس کی مدد کررہے ہیں محض ترحم کی بناء پر۔ اور ترحم بدون کسی کے مصیبت میں پڑے ہوئے پیدا نہیں ہوتا تو ترحم کا سبب غم ہوا اور ایک دوسرے کی اعانت جس کی وجہ سے دنیا کا قیام ہے ترحم پر موقوف ہے تو دنیا کا قیام بھی غم پر ہوا۔ جب غم ایسی چیز ہے تو اگر خدا کسی کو غم دے تو سمجھو کہ بڑی نعمت دی یہ حکمت ہے غم کی پیدائش میں۔

غم ممنوع

اب رہا دوسرا سوال کہ پھر شریعت کا یہ حکم کیوں ہے کہ غم نہ کرو اسکا جواب یہ ہے کہ شریعت نے مطلق غم سے جسکا ایک درجہ اضطراری ہے ممانعت نہیں کی خود حضور ﷺ فرماتے ہیں انا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون(۲) بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غم خود ہوجاوے اُسے ہونے دو۔ اپنے اختیار سے نہ بڑھاؤ پس

(۱) ایک آدمی سب کام نہیں کرسکتا (۲) اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی میں غمگین ہیں۔

ممانعت اختیاری غم سے ہے۔ اسکا پتہ خود قرآن سے چلتا ہے وہ یہ ہے کہ امر و نہی اعمال اختیاریہ پر ہوتی ہے(۱) اگر غم بالکل غیر اختیاری شئی ہے تو لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِی میں یہ لا نہی کا کیسا۔ پس حاصل یہ ہے کہ کچھ غم تو اضطراری ہے اس میں تو حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور کچھ ہم لوگ تدبیروں سے پیدا کر لیتے ہیں بس اس کی ممانعت ہے کیونکہ یہ ضرر رساں ہے(۲) وہ تدبیریں غم بڑھانے کی یہ ہیں کہ واقعہ کو قصداً سوچتے ہو اسکا تذکرہ کرتے ہو اس سے غم بڑھتا ہے اور سوچنا اور بلاضرورت تذکرہ کرنا جو کہ سبب ہے غم کا وہ اختیار میں ہے تو جب ان اسباب کو بند کر دو گے اور اُس طرف سے توجہ اٹھالو گے تو اتنا غم نہ ہوگا۔

بوقت غم ذکر اللہ کرنے کا راز

یہی راز ہے اس کا شریعت نے مواقع غم میں ذکر اللہ کی تعلیم کی ہے جس سے توجہ دوسری چیز کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور وہ دوسری چیز بھی ایسی جس کی شان یہ ہے ﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾(۳) اور جس کی نسبت یہ ارشاد ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾(۴) یہاں لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا انشاء بمعنی خبر ہے اور دوسری آیت میں لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ فرمانا اس کا قرینہ ہے یہاں لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ میں حقیقت مراد ہے وہاں لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا میں مجاز الحمد للہ مدلول آیت کے بیان سے فراغت ہوئی سبحان اللہ اللہ اکبر کیسی جامع تعلیم ہے کہ قلت صبر کے دو سبب جدا جدا بیان فرمائے حزن وخوف پھر ان دو سببوں سے نصًّا ممانعت فرمائی اور اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ (۵) میں اپنی اور مرنے والے کی بھلائی کے مراقبہ کی قیاساً تعلیم

(۱) حکم وممانعت افعال اختیاری پر ہوتا ہے (۲) نقصان دہ (۳) ''آگاہ رہو اللہ کے ذکر سے اطمینان قلب ہوتا ہے'' الرعد:۲۸ (۴) ''جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے اُن پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ تو اندیشہ کرو اور نہ غم کرو'' فصلت:۳۰ (۵) ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا دینگے۔

فرمادی جیسے اس قیاس کی تقریر جس جگہ اعرابی کے اشعار مذکور ہیں اصبر نکن بك صابرین (۱) بیان کی گئی ہے آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی کیسی جامع تعلیم ہے اور کیسے عنوانات ہیں جن سے وہ تعلیم عقلی بھی اسی جامعیت پر کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را (۲)

مراقبہ دفع غم

اور خصوصیت کے ساتھ یہ مراقبہ یعنی تمام واقعات مصیبت میں بھلائی کا سوچنا بہت ہی نافع ہے (۳) اس سے غم کا فور ہوجاتا ہے (۴) اور وہ بھلائیاں فرضی نہیں بلکہ واقعی ہیں کیونکہ ہر مصیبت میں یقیناً منافع (۵) ضرور ہوتے ہیں وقت نہیں رہا ورنہ مصیبت کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل وار بیان کرتا ان واقعات کا اور ان کے منافع کا اجمالاً ایک دوسرے موقع پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ ان واقعات کا ذکر تو اس آیت میں ہے ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ﴾ (۶) اور ثمرات کا ذکر اس آیت میں ہے ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (۷) اور کافی تعلیم صبر کے متعلق اس آیت میں بھی مذکور ہے جس کا بیان اس وقت کیا گیا مگر ضمن میں ایک قصہ کے جو اسکا مصداق ہے ؎

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں (۸)

---

(۱) آپ صبر کیجئے آپ کا صبر ہمارے صبر کا باعث ہوگا (۲) اس عالم کے حسن کی بہار سے دل وجان کو تر وتازہ کرتا ہوں بعض احکام کی ظاہری شکل وصورت سے اور بعض کے باطن سے (۳) مفید (۴) غم دور ہوجاتا ہے (۵) فوائد (۶) ''اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف اور فاقہ سے اور مال وجان اور پھلوں کی کمی سے'' البقرۃ:۱۵۵ (۷) ''اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کے ملک میں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں'' البقرۃ:۱۵۶،۱۵۵ (۸) بہترین صورت یہ ہے کہ محبوب کے اسرار کو دوسروں کے تذکرہ کے ضمن میں بیان کیا جائے۔

پس حق تعالیٰ نے پہلی اُمت کا ایک قصہ بیان فرما کر اس کے ضمن میں جو مقصود اور مطلوب عمل تھا وہ ہم پر ظاہر فرمایا کہ دیکھو جن لوگوں نے اس عمل کو کیا ہے ان کو کس قدر ثمرے (۱) ملے ہیں تم بھی اگر ایسا کرو گے تم کو بھی اسی طرح ثمرات ملیں گے۔ قرآن شریف بڑی نعمت ہے اس کی تعلیم کی طرف علماً وعملاً توجہ کرو ہمارے ذمہ حق ہے کہ قرآن نے جو تعلیم کی ہے اس پر عمل کریں۔ بالخصوص جس چیز کا اس وقت بیان کیا گیا ہے یعنی صبر کو بعض وقت بعض عمل اور بعض احکام مثلاً صبر ہی ہے نفس کو ناگوار ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے فہم میں اس کے مصالح نہیں آتے مگر واقع میں اس میں مصالح ہوتے ہیں۔

محبت کا مقتضاء

جیسا کہ میرے بچپن کا قصہ ہے کہ مجھے اس وقت کنکوّے کا شوق تھا گو اڑانا نہ آتا تھا اور کتابیں بھی پڑھتا تھا جہاں مدرسہ سے آیا کنکوّا (۲) لیکر باہر چلدیا اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہتا تھا سر پر بال تھے اُن کو سر دھونے کا خیال تھا مگر میں جہاں مدرسہ سے آیا کنکوّا لیکر چلدیا کسی طرح اُن کے ہاتھ نہ آتا تھا کہ وہ سر دھوویں ایک روز انہوں نے کھلی کٹورے میں بھگوکر پہلے سے رکھ لی جب میں مدرسہ سے آیا تو فوراً میرے سر میں ڈالدی پھر میں تو مجبور ہوگیا اور سر دھلوانا پڑا گو اس وقت انکا یہ عمل مجھے ناگوار ہوا مگر انہوں نے بسبب محبت کے مآل کار پر نظر کرکے میرے نفع کے واسطے ایسا کیا۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی بندہ کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں تو اس پر راضی رہو خصوص جب تم کو دعویٰ محبت کا ہے تو ذرا سے چرکہ سے بھاگنا نہ چاہئے اگر بلا اختیار کچھ منافع فوت ہوجاویں خواہ ظاہری یا باطنی حتی کہ اگر باطنی حالات وکیفیات بھی چلے جاویں تو اس میں خدا کی حکمت ہے گھبراؤ

(۱) بہترین نتائج (۲) پتنگ بازی۔

نہیں وہ حال یا اسکا بدل پھر لوٹے گا ورنہ یہی کہا جاوے گا ۔

تو بیک زخمے گریزانی زعشق تو بجز نامے چہ میدانی زعشق (۱)

بس یوں سمجھ لیا کرو کہ اس وقت اس کے فوت ہی میں تمہارے لیے مصلحت ہے اگر باقی رہنا ہمارے حق میں مناسب ہوتا تو کبھی بھی نہ زائل (۲) ہوتا ہمیں خدا سے محبت کا دعویٰ کر کے اس قدر نازک مزاجی مناسب نہیں۔ بس اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ اٰله واصحابه اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العالمین۔ (۳)

---

(۱) تم تو ایک زخم لگنے سے ہی گھبرا گئے تمہیں عشق کی خبر ہی نہیں ہے تم تو صرف نام کے عاشق ہو (۲) کبھی نہ مرتا (۳) اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس وعظ پر حاشیہ ایسے وقت لکھ رہا ہوں کہ میں خود عظیم صدمہ کا شکار ہوں کہ برادر مکرم شیخ الحدیث مولانا مشرف علی تھانوی ۳۰ اپریل ۲۰۱۸ء کو مدینہ منورہ میں انتقال کر گئے ہیں مسرت اس بات کی ہے کہ مسجد نبوی میں نماز اور بقیع میں حضرت عثمان غنیؓ کے جوار میں تدفین عمل میں آئی مولانا مشرف صاحب حضرت تھانوی کے نواسے تھے اور چار سال کی عمر میں حضرت تھانوی نے ان کی دستار بندی فرمائی تھی۔ ساری زندگی اتباع سنت کا اہتمام کیا اسی اتباع کے ثمرہ میں اللہ پاک نے جنت البقیع میں پہنچا دیا، مولانا کے اس شعر پر حاشیہ ختم کرتا ہوں۔

یا رب تیرے حبیب کے ہم بھی ہیں امتی
دو گز زمین ہمیں بھی عطا کر حرم کے پاس
عارف عطا ہو پھر سے مدینہ کی حاضری
کھل جائے جاکے اپنا مقدر حرم کے پاس

خلیل احمد تھانوی
۲۸ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ